بوچھار

خدیجہ مستور

مکتبہ جدید لاہور

Scanned with CamScanner

مکتبہ جدید
لاہور

rekhta
Scanned with CamScanner

rekhta

Scanned with CamScanner

جملہ حقوق بحقِ مکتبۂ جدید محفوظ

بار اوّل

قیمت ۴؎

کوآپریٹو کیپٹل پرنٹنگ پریس لاہور میں باہتمام چودھری نذیر احمد چھپ کر مکتبۂ جدید لاہور سے شائع ہوئی

فہرس :-

Scanned with CamScanner

دیباچہ

ابھی پچھلی صدی کی بات ہے کہ اردو ادب میں عورت کا ذکر تک معیوب تھا۔ بہت ہوا۔ تو قصہ کہانیوں میں پریوں اور شہزادیوں کا نام آگیا۔ اُردو شاعر بھی عورت ذات سے ایسی کنّی بچاتے تھے کہ اکثر ان کے محبوب کی جنس پر شبہ ہوتا ہے یہ سچ ہے کہ بسا اوقات وہ محبوب کے ناز و سنگار کی تفصیل سنا کر اس شبہ کو دور کر دیتے تھے۔ تاہم ان کا محبوب یا تو بالائے بام تھا اور یا چلمن کی اوٹ میں یا کہاروں کے کاندھے پر۔ زمین پر عورت کا نقش قدم کہیں نہیں دکھائی دیتا۔ بھلے گھر کی بہو بیٹیوں کا وجود تو ایک سرے سے ہمارے پرانے ادب میں ہے ہی نہیں۔ نواب مرزا شوق پہلے شاعر تھے۔ جنہوں نے اپنی مثنوی زہرِ عشق میں ایک شریف زادی کے عشق کا افسانہ سنایا ہے۔ لیکن سوسائٹی نے مرحوم کو ایسا نکو بنایا کہ الاماں۔ پھر ایک مدت تک کسی شاعر کو پردہ کی آڑ میں جھانکنے کی جرأت نہ ہوئی ؛

بعد میں جب اُردو نثر کا ارتقا ہوا اور ادیبوں کے قلم ناول کی طرف رجوع ہوئے تو عورت کا بھی ذکر خیر ہونے لگا۔ لیکن عورت تو صدیوں سے مرد کیلئے رازِ سربستہ تھی۔ مرد نے اس کے جسم سے لذت اندوز ہونے میں اتنا وقت

Scanned with CamScanner

ضائع کیا۔ کہ اس کے دل و دماغ کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مولویوں کے ایک فرقہ کی رائے ہیں تو عورت بیچاری کے جسم میں روح تھی ہی نہیں۔ عورت کے جذبات اور محسوسات کی خبر کسے تھی، اور انہیں سمجھنے کا سلیقہ کس مرد میں تھا۔ چنانچہ اردو کے پرانے ناول نگار اس مضمون میں بالکل کورے ہیں۔ یہ ان کا بھی قصور نہیں۔ پردہ نے مرد اور عورت کے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ . . . . ۔ کہ ایک جنس دوسری کو نہ دیکھ سکتی تھی۔ نہ سمجھ سکتی تھی۔ یوں پسِ دیوار ایک دوسرے کی سرگوشی سُن لینے سے کیا ہوتا ہے۔ دونوں میں بڑی حد تک حاکم و محکوم کا تعلق تھا۔ اسی جنسی علیحدگی کی وجہ سے ایک مدّت تک اُردو ادب عورت کے کردار سے قطعاً ناواقف رہا۔ اور عورتوں کی جو تصویر پیش کرتا رہا۔ انہیں نسوانیت کے کارٹون کہنا مناسب ہوگا۔ ان ادیبوں کی نیک نیتی میں کلام نہیں۔ لیکن وہ اپنے محدود تجربہ اور مشاہدہ کو وسیع بھی کیسے کر سکتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار جیسے باکمال کو دیکھیئے۔ کہ جہاں عورت کا بیان آیا اور ان کا قلم گم سُم ہوا بات بنائے نہیں بنتی راشد الخیری پہلے مصنف تھے۔ جنہوں نے عورت کی زبوں حالی کو محسوس کیا۔ اور عمر بھر ان کا قلم اس بدبخت کے لئے خون کے آنسو روتا رہا۔ تاہم انکا زاویہ نگاہ لامحالہ مردانہ اصلاح پسندی کا ہے۔ عورت کے جسم اور اس کی روح کی آواز ان بزرگوں تک پہنچ بھی کیسے سکتی تھی:

اور تو اور پریم چند جیسا ہوشمند فن کار عورت کا سامنا ہوتے ہی بغلیں جھانکنے لگتا ہے۔ پہلی بار اس نے اُردو ادب کے میدان میں شریف ادیبوں کو

بے پردہ لا کھڑا کیا۔ لیکن ان کے مطالعہ میں اس نے بڑی بھول چوک کی۔ اور تنقید کی آنکھوں سے دیکھئے تو یہ اس کے فن کا بڑا داغ ہے۔

بلسویں صدی کے اردو ادب نے عورت سے اپنے حجاب کو چھوڑا اور بے تکلف اس کا ذکر ہونے لگا۔ کوئی اسے نصیحت کے کرن پھول پہناتا تھا۔ تو کوئی مت ماری طوائف پر لعن طعن کرتا تھا۔ پھر جب یہ صدی جوان ہونے لگی۔ تو عورتوں میں انگریزی تعلیم عام ہونے لگی۔ پردہ کی جگہ برقع نے اور برقع کی جگہ نقاب نے لے لی۔ اور کہیں کہیں تو نقاب بھی ہوا ہو گئی۔ اب شاعروں کی بن آئی اور انہوں نے رومان کے گیت ایک نئے انداز سے الاپے اور اس رومان پسندی کا عکس نثر پر بھی پڑا۔ شاید کوئی ادیب یا شاعر باقی رہ گیا ہو جو کسی سچ مچ کی سلمیٰ کی یاد میں انٹوائی کھٹوائی لئے نہ پڑا ہو۔

غرض ناولوں اور افسانوں کا مرکزی مضمون عورت کا ذکر قرار پایا۔ سوسائٹی کے مصنوعی جبر نے جو پابندیاں لگا دی تھیں۔ وہ سب درہم برہم ہو گئیں اور رکی ہوئی خواہشات کا ایک سیلاب رنگین وادیوں اور خواب کے محلوں سے گزر کر گھروں کے در و دالان میں گھس آیا۔

یہ سب مردوں کے کرتوت یا کارنامے (جو سمجھئے) تھے۔ وہ اپنی عینک سے اس جنسِ موہوم کو جواب ایک جنسِ لطیف بن گئی تھی۔ گھور رہے تھے لیکن اب بھی ان کے لئے یہ سمجھنا ناممکن تھا کہ عورت زندگی کے مسائل کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ کیا سوچتی اور کیا محسوس کرتی ہے۔ عورت کی

خواہشات محسوسات اور خیالات کا اظہار صرف اہل قلم عورتیں ہی کر سکتی تھیں۔ ایک موضوع کی حیثیت سے تو عورت نے اُردو ادب میں اپنا مقام بنا لیا تھا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جس طرح سن بلوغ میں مسئلہ جنسی انسان کی ساری توجہ کو سمیٹ لیتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ادب کے ابھار کا زمانہ نسوانیت کے ذکر کی نذر ہو گیا۔ اس بحثا بحثی میں عورتوں نے ۱۹۳۰ء سے پہلے کوئی خاص حصہ نہ لیا۔

اس کے بعد بعض خواتین نے اپنی جنس کے نقطۂ نظر کا اظہار ادب میں شروع کیا۔ اس اظہار نے افسانہ کا پیرایہ ڈھونڈا اور آج بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اُردو افسانہ نگاری میں انہوں نے اپنی جگہ بنا لی ہے جس بے باکی اور کھرے پن سے وہ اپنی باتیں سناتی ہیں۔ اس کا خوگر ابھی ہمارا سماج نہیں خصوصاً عورتوں کی زبانی اور بھی اٹ پٹی لگتی ہیں۔ کیونکہ یہ لکھنے والیاں عموماً جنس کے مسئلہ کو چھیڑتی ہیں۔ اور اگر یہ بھڑ کا چھتا نہیں تو پھر کیا ہے۔ اس معاملہ میں ان کی مجبوریوں کو نہ بھولئے۔ ایک تو یہ کہ جنس کا مسئلہ عورت کے لئے جتنا اہم ہے مرد کے لئے اتنا نہیں۔ دوسرے وہ آزادی پسند ہوا کریں مگر موجودہ ماحول انہیں زیادہ آزادی نہیں دیتا اور گھریلو معاملات کے علاوہ دوسرے مسائل سے انہیں کم سابقہ پڑتا ہے۔ تیسرے تعلیم نے ان میں اپنی جنس کی مظلومیت کا زبردست احساس پیدا کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ چاہیں نہ چاہیں ان کا قلم گھوم پھر کر مرد اور عورت کے تعلقات کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔

ان خواتین میں خدیجہ مستور صاحبہ کو ایک بلند مرتبہ حاصل ہے اگر میں غلطی نہیں کرتا۔ تو ان کا نوکِ قلم ابھی نیا ہے۔ اسی لیئے اس میں ایک قسم کی بے ساختگی اور چبھن ہے۔ انہوں نے جو افسانے لکھے ہیں انکا مجموعہ اس کتاب کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ ناظرین ان میں ایک انوکھا پن دیکھیں گے۔ جو ان مرد افسانہ نگاروں میں کمیاب ہے۔ جن کا خاص موضوع جنسی ہے۔ ان افسانوں میں ہم متوسّط یا ادنیٰ طبقہ کی عورتوں کی زندگی کے خدوخال دیکھتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتی ہیں اس میں بڑی اصلیت ہے اور کہتے وقت وہ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتیں۔ معمولی واقعات کو دلچسپ طریقہ سے بیان کرنے کا ڈھنگ انہیں خوب آتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض ناظرین کو یہ کتاب ایک اسپتال معلوم ہو گی جس میں بیمار عورتیں اور مریض مرد جنسی الجھنوں میں گرفتار کسی سرجن کے نشتر کے حاجت مند پڑے ہوئے ہیں۔ میں یہ باور کر سکتا ہوں۔ کہ اندرون خانہ کا منظر ایسا ہی گھنونا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ سوسائٹی ان تحریروں کو پڑھ کر چیخ اٹھتی ہے۔ ڈاڑھیوں کے بال فرطِ غضب سے اینٹھ جاتے ہیں اور گلوں کی رگیں پھول جاتی ہیں۔ وجہ ظاہر ہے۔ اس قسم کی تحریریں سوسائٹی کی ایک دکھتی رگ کو چھیڑتی ہیں۔ اور اسے یاد دلاتی ہیں۔ کہ وہ دراصل بیمار ہے۔ جس طرح اپنے مرض کے متواتر تذکرہ سے مریض چڑچڑا ہو کر چیخنے لگتا ہے۔ اسی طرح یہ بیمار سوسائٹی واویلا مچانے

لگتی ہے۔ میں مانتا ہوں۔ کہ زندگی کے بہت سے ایسے اہم مسائل ہیں، جن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی اور ہمیشہ جنسی کجروی سے لپٹے رہنا ادیب کی اپنی شخصیت کے لئے برا ہے۔ بہرکیف فن کار کو سوسائیٹی کے ہذیان سے سراسیمہ نہ ہونا چاہیئے۔ وہ مصلح یا قائدِ قوم تو نہیں ہے۔ کہ سماجی روگوں کا علاج کرے یا ان روگوں کی دوا تجویز کرے۔ مگر وہ نبض شناس ضرور ہے۔ اور انسانیت کے دُکھ درد کی تشخیص بھی آسانی سے کر سکتا ہے ؛

یہ تو نیز جملۂ معترضہ تھا۔ حق یہ ہے کہ خدیجہ مستور اچھی افسانہ نگار ہیں۔ ان میں ایک عیب ضرور ہے کہ کبھی کبھی ناظر کی الجھن کو مٹانے کے لئے افسانہ کا انجام بھی خواہم خواہ بتلا دیتی ہیں۔ مثلاً 'عشق' اور 'کیا پایا' میں یہ ایک فنّی خامی ہے۔ جس سے انہیں احتراز کرنا چاہیئے۔ زبان وہ صاف لکھتی ہیں۔ البتہ اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا۔ کہ وہ جھوائی ٹولہ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں ؛

مجھے امید ہے کہ اگر صحت نے انہیں خوش اسلوبی سے مشق جاری رکھنے کی اجازت دی اور انہیں سازگار ماحول ملا تو وہ یقیناً اُردو انشا نگاری کی آئندہ ترقی میں نمایاں حصہ لیں گی ؛

اختر حسین رائے پوری

عشق

اقتدار مکان کے اندر دروازہ گھسنے ہی والا تھا۔ کہ اندر سے کسی عورت کے ہولے ہولے گانے کی آواز آنے لگی۔

"عشق میں یوں ہی بے سکوں کٹتی ہیں چند گانیاں"

اور وہ ایک دم ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ بات ہے ——— وہ سوچنے لگا۔ جبھی ہوسٹل چھوڑ کر یہاں رہا گیا ہے۔ طالب علمی کا زمانہ اور یہ حرکتیں ——— اس کا دل چاہا کہ وہ چلا بھی جائے اندر اور پھر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن وہ گانے والی عورت کا لحاظ کر گیا۔ اور اس نے زور سے زنجیر کھٹکھٹائی گانے کی آواز بند ہو گئی۔ اندر جوتیوں کی سٹ پٹ ہونے لگی اور ذرا ہی دیر بعد بند دروازے کھل گئے۔ اب اس کے سامنے ایک بائیس تیئیس سالہ عورت کھڑی تھی۔ بھاری بھر کم گولے۔ گندمی رنگ۔ میلی کچیلی نیلی ساری پہنے

rekhta

Scanned with CamScanner

اور ہاتھوں میں گیلا آٹا لگا ہوا ۔

"کون ہیں آپ؟" عورت نے اسے بہت غور سے دیکھنے کے بعد پوچھا

" جمیل صاحب ہیں؟" اس نے عورت سے اُلٹا سوال کر دیا ۔

"جی ہاں سو رہے ہیں"۔ عورت نے لجا کر جواب دیا۔ اور اس کی سیاہ آنکھوں کو چھوتے ہوئے چکنے چکنے پپوٹوں نے چھپا لیا ۔

"میں جگا لوں گا"۔ اس نے کہا اور عورت دروازے کے پاس سے ایک طرف ہٹ گئی ۔ تو وہ اندر داخل ہو گیا ۔

"وہ سو رہے ہیں" عورت سامنے چھوٹے سے کمرے کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے باورچی خانے میں چلی گئی ۔ اس نے سرسری نظر سے چھوٹے سے مکان کا جائزہ لیا اور جمیل کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ جمیل اپنے صاف ستھرے بستر پر بے خبر سویا ہوا تھا ۔ اسے اس طرح بے خبر سویا ہوا دیکھ کر افتندا کا دل چاہا کہ جمیل کی فاختہ اُڑا دی جائے ۔ بچپن میں دونوں کس قدر دشمن تھے ۔ ایک دوسرے کی نیند کے ۔ جہاں سوتا پاتے اور اڑا دی جاتی فاختہ اور اب بڑے ہونے کے بعد بھی وہ ایک دوسرے کی نیند کے دشمن ہی رہے ۔ لیکن اس وقت اسے فاختہ اڑانے کا سامان کہاں سے ملتا ۔ وہ اس کے تلوے میں گدگدی کرنے لگا ۔

"اُونھ! ہُونھ" جمیل نے کروٹ لی اور پھر بے خبر ہو گیا ۔ اس نے پھر زور سے گدگدایا ۔

"اری سونے بھی دے" ——— وہ آنکھیں بند کئے کئے بڑبڑایا ۔

"ہوں"! اقتدا مسکرایا۔ اور اچٹتی سی نظر سے سامنے باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا۔ جو جلدی جلدی روٹیاں پکا رہی تھی۔

"ابے کیا عورت کے خواب دیکھ رہا ہے"۔ اس نے جمیل کو زور سے جھنجھوڑ ڈالا اور وہ بڑبڑا کر اٹھ گیا۔ ذرا دیر تک وہ حیرت سے اقتدا کو دیکھتا رہا اور پھر ایک دم اس سے لپٹ گیا۔

"کتنے دن بعد آیا ہے تو، اُف۔ فوہ، پورے دو سال"۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے پلنگ پر بیٹھ گئے۔

"دراصل بڑا مصروف رہا۔ اور پھر چھٹی بھی نہ ملی جو آسکتا، اور ہاں وہ کون ہے۔ بھابی؟" اس نے باورچی خانے کی طرف اشارہ کیا۔

"بھاگ" —— جمیل نے اس کے بازو پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔ "نوکرانی ہے"۔ اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"بڑی بدمعاش ہے۔ اور بقول اس کے مجھ سے "عشق" کرتی ہے۔ اور نہ جانے کتنوں سے کرچکی ہوگی" جمیل نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

"ہے تو یار اچھی۔ کچھ نمکین سہی۔ تجھے اب نمک تو نہ منگانا پڑتا ہوگا؟"

"ہاں —— اُفوہ"۔ ابھی چھوڑ ان باتوں کو۔ چل منہ ہاتھ دھویا جائے۔ پھر کھانا کھائیں۔ تو بھی بھوکا ہوگا۔ ایک بج رہا ہے۔ آج یہ دیر سے آئی تھی کھانا پکانے"۔ جمیل نے کہا۔ اور پھر دونوں کمرے سے کچھ دُور بنے ہوئے چھوٹے سے غسل خانے میں منہ دھونے چلے گئے۔ اتنے میں عورت نے گرم گرم روٹیاں اور قورمے سے بھری ہوئی ڈش میز پر لاکر رکھ دی۔ وہ

دونوں تولیوں سے منہ پونچھتے ہوئے آئے اور کرسیاں کھینچ کر کھانے بیٹھ گئے۔

"اچھا پکاتی ہے کھانا" اقتدا نے کہا۔

"ہاں! اسی لئے تو اسے رکھے ہوئے ہوں۔ ورنہ کب کا نکال چکا ہوتا۔ سالی سب میں کہتی پھرتی ہے۔ کہ میں اس سے عشق کرتا ہوں اور وہ مجھ سے 'عشق' فرماتی ہیں" ——— جمیل نے باورچی خانے کی طرف گردن گھمائی ——— اے اے بہو پانی تو لاؤ۔ یا سینے پر گھونسے مار مار کر تو اسے اتاروں"۔ وہ شرارت سے مسکرایا۔

"جی لائی۔"

اقتدا نے اپنی نظریں کمرے کے باہر دوڑائیں۔ بہو پھرتی سے گلاس صاف کر رہی تھی:

"بہو ——— خاصا میٹھا لفظ ہے۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟"

"ارے نہیں! یہ تو میں یونہی اسے بہو کہنے لگا ہوں، سچ یار بڑی بے غیرت عورت ہے۔ ایسی بے باکی سے عشق و محبت کی باتیں کرتی ہے۔ کہ بعض وقت تو مجھے شرم آنے لگتی ہے"۔

"ہاں۔ لیکن دیکھنے سے تو نہیں معلوم ہوتا۔ کہ یہ ایسی ہو گی۔ کیسی لجائی لجائی سی لگتی ہے"۔ اقتدا نے نوالہ بناتے ہوئے کہا:

"خوب! اور یہ نہیں دیکھا کہ کولھے کیسے پھینک پھینک کر چلتی ہے بدمعاش۔ یہی تو پہچان ہے بری عورتوں کی"۔ جمیل نے کہا:

"لیکن یار یہ تو بتاؤ کہ آخر معاملہ چلا کیسے ؟ کیا تم خود سے عشق کرنے لگے"۔

"نہیں بھئی ! اس بار جب تم آئے ہو تو یہ جانتے ہی تھے ۔ کہ میں ہوسٹل میں لڑکوں سے کس قدر نالاں تھا ۔ نہ خود پڑھتے نہ پڑھنے دیتے ہیں ۔ میں نے بھی ہوسٹل چھوڑ کر یہ چھوٹا سا مکان لے لیا اور ہوٹل میں کر لیا کھانے کا انتظام لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد وہاں کے کھانے سے طبیعت خراب ہو گئی ، تو میرے ایک دوست نے اس عورت کو کھانا پکانے کے لئے یہاں رکھا دیا ۔ پہلے یہ انہیں کے یہاں کام کرتی تھی ۔ اور" ——— جمیل چپ ہو گیا بھو پانی لیئے آ رہی تھی ۔

" رکھ دو یہاں میز پر ، تم ایسی ظالم ہو کہ میرے دوست کو بغیر پانی کے آدھا کھانا کھلوایا ۔" جمیل نے ہنس کر کہا ۔ اور بھو اس پر ایک ترچھی نظر ڈالتی ہوئی کمرے سے نکل گئی ۔

"ہاں اور کیا ؟"

"تو میں کہہ رہا تھا کہ" ——— جمیل نے پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا ۔ اور پھر پانی پینے کے بعد کہنے لگا ——— " یہ وہیں ملازم تھی ۔ کہیں ایک دن میرے دوست نے اسے چھیڑ دیا ۔ کہ مجھے تم سے عشق ہے ، شادی کروں گا ۔ تو بس تمہارے ساتھ ، ورنہ نہیں ۔ پھر کیا تھا ۔ اس نے ملازمت اور عشق دونوں کے سخت فرائض انجام دینا شروع کر دیئے ۔ چند دن بعد میرے دوست کی شادی ہونے لگی ۔ تو وہ ڈرا کہ کہیں یہ میری بیوی سے کچھ نہ بک دے ، اپنی ماں سے یہ کہہ کر اسے

نکلوا دیا۔ کہ بہت بدمعاش ہے ماما۔ میں نے اسے دوکانداروں سے ننگا ننگا مذاق کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں نے نکال باہر کیا۔ تھوڑے دن تک نوسالی میرے دوست کے عشق میں جان ہٹتی رہی اپنی اور اب مجھ سے "عشق" ہو رہا ہے۔" جمیل اتنے زور سے ہنسا کہ اس کے منہ کا چبا ہوا نوالہ دکھائی دینے لگا۔

"اور یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں۔ کہ عشق شروع کس کی طرف سے ہوا۔" اقتدا نے پوچھا۔

"ارے یار مجھے اس کا حال تو معلوم ہی تھا۔ ایک دن مذاق سے چھیڑ دیا دل بہلانے کو۔ بس اس دن سے میری جان کو آ گئی۔ ہر ملنڈ پوچھا کرتی ہے۔ کہ شادی کب کرو گے۔ جیسے مجھے بیوی نصیب ہی نہ ہو گی۔"

"ہو گی کیوں نہیں۔ چاند جیسی۔"

دونوں کھانا کھا چکے تھے۔ جمیل نے بہرکو آواز دی۔ وہ آئی۔ کچھ بہکے بہکے قدم ڈالتی۔ اور کھانے کے برتن اٹھا کر چلی گئی اور پھر وہ دونو ایک ہی بستر پر دراز ہو گئے۔

"تمہیں کچھ چیزیں دکھاؤں" جمیل لیٹے سے ایک دم اُٹھ گیا۔ اور کپڑوں کی الماری کھول کر اک وفتی کا ڈبہ لئے اقتدا کے پاس آ بیٹھا اور ڈبہ کھول کر چھ سات بڑے عجیب عجیب گہرے رنگوں کے مفلر دس بارہ ریشمیں تصویریں چھپے رومال اور چھ سات امریکن گولڈ کی انگوٹھیاں بستر پر ڈال دیں ۔

"یہ بہو نے مجھے تحفہ دیئے ہیں۔ سمجھے دوست"۔ وہ ہنسا۔ "کمبخت اپنی ساری تنخواہ یوں ہی برباد کرتی ہے۔ بھلا میرے کس کام کی یہ چیزیں۔ ایک بھی تو ڈھنگ کی نہیں۔ ہزار دفعہ ڈانٹا۔ کہ یہ مت کیا کر۔ لیکن وہ زبردستی میرے سر منڈھ دیتی ہے۔ اب جب اسے نکالنے لگوں گا۔ تو سب کی قیمت دے دوں گا"۔ وہ سب چیزیں ڈبہ میں بند کر کے پھر سے الماری میں رکھ آیا۔ اور اقتدا سوچ رہا تھا۔ کہ کس قدر چالاک عورت ہے۔ تحفہ لینے کے بجائے تحفہ دے کر مردوں کو رجھاتی ہے۔ دوست واقعی بڑی بدمعاش عورت ہے۔ اقتدا نے باورچی خانے کی طرف نظریں دوڑائیں۔ اور دو تین انگڑائیاں لے کر تکیہ میں منہ چھپا لیا۔

"تمہیں نیند آ رہی ہے؟" جمیل نے پوچھا۔

"ہاں کچھ یونہی سی۔ تھکن جو بہت ہے۔"

"تو پھر تم سو رہو۔ جب تک میں کچھ ضروری کتابیں اور کاپیاں خرید لاؤں" جمیل نے کہا۔

"اس کڑاکے کی دھوپ میں؟"

"ارے بابا ذرا دیر کی بات ہے"۔ اور وہ اُٹھ کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

"اور بہو؟"

"جب دل چاہے گا۔ کھانا لے کر چلی جائے گی اپنے گھر۔" وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر چلا گیا۔ اور اقتدا آنکھیں بند کرتے ہی جیسے بے خبر سو گیا۔

Scanned with CamScanner

اسے سوئے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ کہ پختہ زمین پر کسی برتن کے گرنے کی تیز آواز نے اسے سوتے سے چونکا دیا۔ اس نے کروٹ لے کر دیکھا۔ کہ بہو نل کے پاس بیٹھی برتن صاف کر رہی ہے اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

ع "عشق میں یونہی بے سکوں کٹتی ہیں جندگانیاں"

ہلکی ہلکی نیند میں اس نے سنا کوئی گا رہا ہے دُور سے ــــ بہت دُور سے ـــــ برتنوں کی زور سے کھڑ بڑ ہوئی اور اس کی نیند اُچاٹ ہو گئی۔ اس نے دیکھا۔ کہ بہو الماری میں برتن سجاتے ہوئے گا رہی ہے "عشق میں یُوں ہی

گانے میں تو خاصی اچھی آواز ہے۔ لیکن 'ش' اور 'ز' ادا نہ ہونے سے کیسا بُرا سا لگتا ہے۔ اس نے سوچا۔ اور پھر پیاس محسوس کرتے ہوئے بہو کو آواز دی۔

"ایک گلاس پانی ـــــ بہو۔"

"لائی میاں۔"

وہ پلنگ سے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ بہو اپنے بھاری بھاری گوٹھے مٹکاتی۔ ذرا لجاتی، کمرے میں آئی اور پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور نظریں جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اسے غور سے دیکھا ـــــ بھولے بھولے سے چہرے پر ہلکا سا دبا دبا وقار، آنکھوں میں عجیب سی چمک۔ اور بے کل سا جسم ـــــ وہ شربت کے گھونٹوں کی طرح

آہستہ آہستہ پانی پیتے ہوئے سوچنے لگا۔ کہ اگر بہو کو تھوڑا سا چھیڑا جائے تو جمیل کے آنے تک وقت مزے سے کٹ جائے گا۔

"بہت اچھا گاتی ہو"۔ اس نے ہنس کر کہا۔ اور خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔

وہ کچھ اٹھلائی، سمٹی اور جھکی جھکی نظروں سے زمین تکنے لگی۔

"بیٹھ جاؤ"۔ اس نے کہا اور وہ پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

"تم اپنے گھر نہیں گئیں؟"

"جی اب کام کر چکی ہوں تو جاؤں گی"۔ وہ بولی۔

اور راقتدا سوچ رہا تھا۔ کہ اب کیا بات کی جائے۔ جو اس کی زبانی اس کے عشق کی داستانیں سنی جائیں۔

"یہاں تو اچھی طرح رہتی ہو نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ آں"۔ بہو نے ایک نکلتی ہوئی آہ کو دبایا۔

"بابو جی تو تم کو بہت چاہتے ہیں۔"

"آپ سے کہتے تھے کیا؟؟؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔ چہرے پر مسرت کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ اور اس کے چہرے کا دیا دبا وقار بالکل ہی دب گیا تھا۔

"ہاں کہتے تھے۔ کہ میں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں بہو کو"۔ وہ تابڑ توڑ جھوٹ بولے جا رہا تھا۔ بہو کچھ لجائی مسکرائی اور پھر ایک دم رنجیدہ ہو گئی۔

"نہیں اب نہیں چاہتے۔ پہلے بہت چاہتے تھے" - وہ ایک آہ بھر کر کہنے لگی ——— اب جبکہ آپ کو معلوم ہی ہے۔ تو پھر بتانے میں کیا "مجائقہ" - پہلے تو رات کو دو دو بجے تک مجھے اپنے پاس روکا کرتے تھے۔ کالج سے آکر وہ باورچی خانے میں بیٹھا کرتے تھے۔ پر اب تو جانے کتنے دن سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ "جرا جرا" سے قصور پر ڈانٹتے ہیں ——— ہائے کیا دن تھے وہ بھی۔ جب انہیں مجھ سے "عسق" تھا۔" اس نے رنجیدہ ہو کر سر جھکا لیا۔ اور اقتدا کو ہنسی آتے آتے رہ گئی۔

"عشق ہوتا ہی بڑا ظالم ہے۔" اقتدا نے اپنی ہنسی سے پھڑپھڑاتے ہوئے ہونٹ دانتوں تلے دبا لئے۔ کہ کہیں ہنسی نکل گئی۔ تو پھر بھو کی باتیں اک دم ختم ہو جائیں گی۔

"بڑا ظالم" اس نے ایک زوردار آہ بھری۔

"ہمارا ہی دل جانتا ہے"۔ ——— وہ ذرا دیر چپ رہنے کے بعد پھر کہنے لگی۔ "اس کے پیچھے دو دو وقت کھانا نہیں کھایا، اپنے پیسے کو پیسہ نہیں سمجھا۔ جو کچھ کمایا سب "عسق" کی راہ میں لٹا دیا۔ اپنے "جات" والوں میں جس سے "سادی" لگی تھی۔ انکار کر دیا۔ سب کے برے ہو گئے۔ بدنامی الگ مول لی۔ لیکن کسی نے بھی اپنا نہ بنایا۔ گھر کے ایک کونے میں بیبیوں کی طرح نہ بٹھایا ——— "ہاں آں"! اس نے ٹھنڈی سانس بھری، اب وہ بے حد رنجیدہ ہو رہی تھی۔

"کون ذات ہو ؟"

"دھنیے"۔

"تم نے بڑا کیا جو شادی نہ کی" اسے ذرا دیر کے لئے بہو کی حالت پر رحم آگیا۔

"کیسے کرتے۔ اس زمانے میں ایک بابو جی کے یہاں نوکری کرتے تھے۔ انہیں مجھ سے "عشق" ہو گیا۔ کہنے لگے۔ کہیں تم سے "شادی کروں گا میں نے اپنے لوگوں میں انکار کر دیا"۔

"تو اب کر لو تم اپنی ذات میں شادی"۔

"اب نہیں کروں گی، اب تو وہ لوگ مجھے "جرا" بھی اچھے نہیں لگتے میلے کچیلے۔ نہ "انگریجی" پڑھے نہ لکھے۔ اور پھر وہ لوگ کیا جانیں آپ لوگوں جیسا "عشق" کرنا۔ پہلے تو خیر میں اپنے ہی لوگوں میں شادی کرنی۔ لیکن اب" ——— اس نے نظریں جھکا لیں۔

"ہاں سچ ہے ——— وہ مسکرایا ——— "آنکھیں جو پھٹ گئی ہیں۔ ہم لوگوں کو دیکھ دیکھ کر۔ اس نے سوچا۔

"اب تک تم سے کتنوں نے محبت کی ہو گی ؟"

"جن کے یہاں نوکری کی۔ ان سب نے مجھ پر جان دی۔ مگر افسوس کسی نے بھی نباہا نا، کوئی "جندگی" کا ساتھ دے جب کی بات اور اسی کے لئے میں نے اپنے کو برباد و خوار کر رکھا ہے۔

"لیکن یہ بابو جی تو تم کو بہت چاہتے ہیں"۔

"سچ"۔

"ہاں ہاں" انتدا نے اسے یقین دلانے کے لئے بہت ہی سنجی
سے کہا۔ اور وہ سر جھکا کر نہ جانے کیا کیا سوچنے لگی۔ وہ غور سے اس
چہرے کو دیکھنے لگا۔ کچھ۔ بے چینی، کچھ مسرت اور ہلکی سی مایوسی کے ملے
جلے جذبات اس کے چہرے سے نمایاں تھے۔ وہ اک دم جانے کے
لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھیو۔"

"نہیں میاں اب جرا گھر جا کر دیکھ لوں۔ دادا کو کھانا دے آؤں۔
اندھا ہے۔ بھوکا پیاسا پڑا ہوگا۔ ویسے ہی میں ایسی "بیہوس" رہی ہوں
ان باوچی کے پیچھے کہ دو دو وقت بوڑھے کو کھانا نہیں دیا جا کر۔ ابھی
آجاؤں گی تھوڑی دیر میں۔"

وہ کولھے مٹکاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور باورچی خانے کا دروازہ
بند کر کے باہر چلی گئی۔ انتدا پھر لیٹ گیا اور میز پر پڑی ہوئی کتاب اٹھا
کر دیکھنے لگا۔

ایک دو گھنٹے کے بعد جمیل دو لڑکوں کے ساتھ آگیا۔ اور وہ کتاب
رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ میرے بچپن کے دوست مسٹر انتدا ہیں اور یہ میرے
کلاس فیلو منیر اور نواب۔ جمیل نے تینوں کا تعارف ایک دوسرے سے
کرا دیا۔ اور وہ ہاتھ ملا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"بھو نہیں آئی اب تک ورنہ چائے کا دور چلتا"۔ جمیل نے کہا۔

"اچھا بہو نہیں ہے۔ جبھی تو میں کہوں کہ گھر کچھ سونا سونا ہو رہا ہے اور تم بھی پریشان سے دکھائی دے رہے ہو"۔ منیر نے کہا۔

اور سب زور سے ہنس پڑے۔ اتنے میں بہو آگئی۔ اور سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس وقت وہ سفید ساری پہن کر اور بالوں کو سنوار کر آئی تھی۔ اور ہونٹوں پر گلابی رنگ بھی لگا ہوا تھا۔

یہ دادا کو دیکھنے تو کیا۔ دراصل ٹھاٹھ کرنے گئی تھی۔۔ اقتدا نے سوچا۔

"چائے بناؤ جلدی سے بہو" جمیل نے کہا۔

اور بہو چولہے میں آگ جلانے لگی۔

"تمہاری بہو کیسا مسر مسر کام کرتی ہے"۔ نواب نے باورچی خانے کی طرف نظریں دوڑائیں۔

"بہو جو ہے بچاری" منیر مسکرایا۔

"اور پھر عشق کا موسم ہے۔ اس لئے بھی غریب سست رہتی ہے"۔ اقتدا ہنسا۔

"ہوں"۔ جمیل کچھ فاتحانہ طریقہ پر اکڑ کر بیٹھ گیا۔

"اگر مجھے ایسی ماما مل جائے تو دوست کچھ دن کے لئے تو زندگی کا لطف آجائے"۔ نواب نے اپنی چونچ جیسی ناک کے نتھنے پھڑکائے۔

"اور میں تو" ——— منیر نے منہ میں آیا ہوا پانی غٹ سے نگل لیا۔

اور سب پر ہنسنے کا دورہ پڑ گیا۔ لیکن جیسے ہی بہو چائے کی ٹرے

Scanned with CamScanner

اٹھائے اندر آنے لگی۔ سب سنجیدہ ہو گئے۔ جمیل نے میز کھسکائی۔ اور کرسیاں اس کے گرد ڈال دیں۔ بہو نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ افنداپیالیوں میں چائے بنانے لگا۔

"بیٹھ جاؤ" منیر نے کہا۔ اور وہ سکڑ کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

"بہو ہم لوگوں نے سوچا ہے۔ کہ جمیل کا امتحان ہونے کے بعد چپ سے تمہاری اور ان کی شادی کر دیں۔" ——— نواب انتہائی سنجیدگی سے کہنے لگا۔" اور چپکے سے اسلئے کہ ان کے والدین کو خبر نہ ہو۔"

بہو نے حیرت سے نواب کو دیکھا۔ جیسے اسے اس کی بات پر یقین نہ آرہا ہو۔ نواب تو ہمیشہ اسے بھابھی بھابھی کہہ کر مذاق کیا کرتا تھا۔ اس نے کبھی ایسی سنجیدگی سے بات ہی نہ کی تھی۔

"آپ تو ہنستے ہیں بھیّا۔" بہو نے لجا کر ساری کا پلو سر پر کھینچ لیا۔

"نہیں۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں" نواب اور زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ "آپ لوگوں کی مرضی۔ ساس سسر کی تو خدمت کر کے اور پاؤں پڑ کے منا لیں گے"۔ اس نے سر جھکا لیا۔ منیر اور افندا اور جمیل ہنسی روکتے روکتے بیدم ہوئے جا رہے تھے۔

"نہیں بہو۔ تم فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" افندا نے اسے اطمینان دلایا۔ جمیل اپنے دیدے مٹکا رہا تھا۔

"نہیں نہیں جی۔ ہم سب ساتھ دیں گے بہو کا اور پھر کوئی بات بھی ہے کہ ایسا نہ ہو۔ آخر جمیل بھی تو "عشق" کرتا ہے"۔ منیر نے کہا۔

Scanned with CamScanner

"جی ہاں۔ آپ سب ہی لوگوں کا انتظار ہے" ۔ اور بہو سچ مچ کی بہوؤں کی طرح لجا کر کمرے سے بھاگ گئی۔

"اچھا۔ اب سب لوگ گھومنے چلیں گے"۔ منیر چائے کی خالی پیالی زور سے طشتری میں رکھتے ہوئے کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

"ضرور" اقتدا بولا۔ اور پھر سب چھوٹے سے آئینہ میں باری باری اپنی ٹائیوں کی گرہیں درست کرنے کے بعد کمرے سے نکل آئے۔

"کیا پکے گا شام کے لئے" بہو نے جمیل سے پوچھا۔

"بالکل بیویوں کی طرح بات کرتی ہے تم سے"۔ نواب نے انگریزی میں کہا۔

"ہاں" جمیل ہنسنے لگا۔

"جو دل چاہے پکا لینا"۔ جمیل نے بہو کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور وہ اتنی لجائی۔ کہ دوہری ہو گئی۔ چہرے پر خون چھلکنے لگا۔

"بہت خوش ہے آج، کتنے ہی دن بعد جو میں نے سیدھے منہ بات کی ہے نا۔"

جمیل نے انگریزی میں کہا۔ اور پھر سب ہنستے ہوئے باہر نکل گئے۔

رات کے دس بجے اقتدا اور جمیل واپس ہوئے صحن میں دونوں کے لئے پلنگ بچھے ہوئے تھے اور صاف ستھرے بستر چاندنی میں

لیٹ جانے کی دعوت دے رہے تھے۔ بہو باورچی خانے میں دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھے بیٹھے سو رہی تھی۔ جوتوں کی چرمر سے ایک دم جاگ اٹھی۔ پھر جلدی جلدی کھانا نکالنے لگی۔ وہ دونوں کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ اور بہو قریب ہی زمین پر بیٹھ کر بکھرے ہوئے چاند کو گھورنے لگی۔ اقتدا کا دل چاہا۔ کہ بہو کو چھیڑا جائے لیکن بہت دیر تک گھومنے سے اس کی طبیعت مکدر سی ہو رہی تھی اور جمیل بھی خاموش تھا۔ کھانے کے بعد دونوں اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ بہو نے برتن باورچی خانے میں رکھ دیئے اور پھر بیٹھ کر چاند کو گھورنے لگی۔

"اس عورت کو ہر وقت کوئی نہ کوئی آنکھ لڑانے کے لئے ملنا ہی چاہیئے۔ تم نہیں بول رہے تو چاند سے "عشق ہو رہا ہے"۔ آخر اقتدا سے نہ رہا گیا اور اس نے انگریزی میں کہہ ہی دیا۔

"سخت آوارہ ہے"۔ جمیل نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

"اب جاؤ بہو۔ اپنا کھانا لے کر" جمیل نے بڑی ہی بیزاری سے کہا۔

بہو اُٹھ کر باہر جانے لگی۔

"کھانا نہیں لیا تم نے؟" جمیل نے ڈانٹ کر پوچھا اور وہ مڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"بھوک نہیں ہے آج بابو جی۔"

Scanned with CamScanner

"عشق" سے پیٹ بھرے گی آج"۔ افندا بہت ہی دبی سی آواز میں بولا۔ اور پھر زور سے کہنے لگا: "نہیں کھانا لے جاؤ۔ آخر تمہارا دادا بھی تو بھوکا ہو گا۔"

"بہت اچھا۔" بہو نے اپنا کھانا نکالا۔ اور پھر جانے کے لئے دروازہ کی طرف مُڑی۔

"بہو تڑکے ہی آجانا۔ افندا صبح کی گاڑی سے جائیں گے۔ چائے میں دیر نہ ہو۔" بہو کے جاتے جاتے جمیل نے حکم لگایا اور جب وہ چلی گئی تو اس نے اٹھ کر دروازے بند کر لئے۔ صبح جلدی اٹھنا تھا اس لئے دونوں سونے کی کوشش کرنے لگے۔ صبح تڑکے اپنے قریب ہوتی ہوئی کھُسر پھُسر سے افندا کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن یہ دیکھتے ہی اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں کہ بہو جمیل کے پاس بیٹھی بڑی عجیب عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے۔

"میں کہتا ہوں۔ کہ اب یہاں سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ افندا جاگ پڑے گا"

"اچھا جاتی ہوں —— پُچ پُچ ——"

افندا نے کنکھیوں سے دیکھا۔ کہ بہو جمیل کے پیروں پر جھکی ہوئی پیار کر رہی ہے۔

"میرے آقا۔ میرے سرتاج" وہ پاؤں چومتے ہوئے گنگنائی اور جمیل جلدی سے اپنے پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گیا۔ صبح کا تارا دم توڑ رہا تھا اور سڑک پر تانگے کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ شروع ہو گئی تھی۔ بہو

Scanned with CamScanner

باورچی خانے میں چلی گئی۔ افتدا کو اس کے یوں پاؤں چومنے پر ترس آرہا تھا۔ لیکن جب اس نے یہ سوچا۔ کہ یہ نہ جانے کتنوں کے پاؤں یونہی چوم چکی ہو گی۔ تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات امنڈنے لگے۔

"اٹھو" جمیل نے اسے سویا ہوا سمجھ کر جگایا اور وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔ اور پھر ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد دونوں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پھر جب کپڑے تبدیل کر چکے تو بہو نے چائے کا سامان میز پر سجادیا۔ وہ چائے پینے لگے۔

چائے کے بعد جمیل نے افتدا کا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ بہو اس طرح منہ بسورے کھڑی تھی۔ جیسے اسے افتدا کے جانے کا سخت رنج ہو رہا ہو۔

"سلام بہو۔ ہمیں اپنی شادی میں بھول نہ جانا" دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے کہا۔ اور جمیل ہنس دیا۔

چار سال بعد افتدا پھر اپنے دوست جمیل اور اس کی نئی نویلی بیوی سے ملنے آیا ہوا تھا۔ آج جمیل اور اس کی بیوی کہیں ٹی پارٹی میں مدعو تھے۔ اس لئے وہ اس وقت تنہا پڑا ایک کتاب دیکھ رہا تھا اور جب وہ پڑھتے پڑھتے اکتا گیا۔ تو اسے بہو کا خیال آگیا۔ اس بار جب وہ آیا تھا۔ تو بہو کی وجہ سے اس کا دل کس قدر بہلا رہا تھا۔ جب سے وہ آیا تھا۔ اس نے کیسا کیسا چاہا کہ بہو کے متعلق جمیل سے پوچھے بہو کو یہ معلوم ہے یا نہیں۔ کہ وہ یہیں کالج میں ملازم ہو گیا ہے ؟

اور کیا وہ کبھی اسے ملی بھی یا نہیں ؟ اب کس سے "عشق" ہو رہا ہے لیکن وہ ایک بات بھی نہ پوچھ سکا۔ نئی نویلی بیوی۔ کالج کے ٹائم کے علاوہ سائے کی طرح جمیل کے پیچھے لگی رہتی۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تنہا پڑے رہنے کے بعد وہ کپڑے تبدیل کر کے پیدل گھومنے نکل گیا۔ اور جب وہ واپس ہونے لگا۔ تو غیرارادی طور پر وہ ایک گلی میں ہو لیا۔ جہاں نالیوں میں بہتے ہوئے گندے پانی سے بُو کے بھبکے اڑ رہے تھے۔ اور جگہ جگہ پر کوڑے کے چھوٹے بڑے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اس نے سینٹ میں بسا ہؤا رومال ناک پر رکھ لیا اور جلدی جلدی گلی طے کرنے لگا۔ "تنک تنک تائیں تائیں عشق میں یونہی بے سکوں" ——— گلی کی موڑ پر وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک دری دوکان میں بیٹھی ہوئی عورت دھنکی سے روئی دھنک دھنک کر گا رہی تھی۔

"بھو!" وہ بے ساختہ پکار اُٹھا۔

"کون"!! ——— بھو نے جھکا ہؤا سر اٹھایا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ وہی ہے۔ ادھر اندا کو بھو کو دیکھ کر کچھ حیرت سی ہو رہی تھی۔ بالکل لٹا لٹا سا چہرہ اور بالکل دبلی پتلی۔

"آپ میاں ——— کب آئے ؟" تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

"کل" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر کہنے لگا۔

"کہو کیا حال چال ہیں ——— کیا نوکری کرنا چھوڑ دی۔ جو یہ کام

Scanned with CamScanner

کر رہی ہو ؟"

"ہاں ! میاں اب کلیجے میں بوتا نہیں رہا نوکری کرنے کا۔" وہ سر جھکا کر نہ جانے کیا سوچنے لگی۔

"پھر 'عسق' کیسے ہونا ہوگا ؟" اس نے مذاق سے پوچھا۔

"عسق" ـــــــ بہو کچھ تڑپ سی گئی۔ لٹے ہوئے چہرے پر ایک رنگ آیا اور غائب ہو گیا۔

"آپ کے جانے کے بعد" ـــــــ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ بابو جی نے نکال دیا تھا۔ پھر منیر میاں اور نواب میاں نے اپنے اپنے ہاں نوکر رکھا۔ انھوں نے بھی چار دن کی محبت کی اور نکال باہر کیا۔ پھر دوسری بہت سی جگہوں پر بھی کام کیا تو انھوں نے بھی" ـــــــ وہ چپ ہو گئی۔ اور ایک لمحے بعد بولی ـــــــ "جندگی" کسی نے بھی نہ دیا۔" وہ بے حد رنجیدہ ہو کر روئی کے ڈھیر کو تکنے لگی۔

"عمر بھر غلامی کرتی" وہ جیسے خواب میں بڑبڑائی اور اقتدا کو ایسا محسوس ہوا۔ کہ کسی نے اس کے دل پر برچھی مار دی ہو۔

"تم نے شادی نہیں کی اپنے لوگوں میں ؟"

"نہیں میاں۔ اپنے لوگ تو مجھے 'جرا' بھی اچھے نہیں لگتے۔ میلے کچیلے۔ نہ پڑھے نہ لکھے اور پھر وہ کیا جانیں آپ لوگوں جیسی محبت کرنا۔ بغیر "سادی" کے بھی 'جندگی' کٹ جائے گی۔" وہ سر جھکا کر پھر کچھ سوچنے لگی شاید بہت زیادہ سوچنے ہی کی وجہ سے اسکی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔

"میاں بڑے بڑے دکھ جھیلے" ــــــــــ وہ پھر کہنے لگی
دادا مر گیا۔ پنچایت نے مجھے اپنے محلے سے نکلوا دیا۔ اسی 'عشق' کے کارن۔ ــــــــــ اب یہ کام کرتی ہوں۔ پیٹ بھرنے کو پیسہ مل ہی جاتا ہے۔" ــــــــــ اس نے نظریں جھکا دیں۔

آفندا نے دیکھا۔ کہ اس کے پچکے۔ چکنے پپوٹوں پر پوری نہ ہونے والی تمناؤں کی شکنیں پڑ گئی تھیں۔ دو آدمی سوٹ میں ملبوس انگریزی میں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ بہو انہیں اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

"اب اس گلی میں پڑی رہتی ہوں۔ اور جب کبھی ادھر سے کوئی آپ لوگوں جیسا آدمی جاتے دیکھتی ہوں۔ تو بیتا ہوا 'جمانہ' یاد آجاتا ہے اور" ــــــــــ

اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ نکلے۔

"بہو" ــــــــــ آفندا کے ہونٹوں سے کئی دبی دبی آہیں نکل گئیں۔ دل میں ایک ٹیس سی ہونے لگی۔ اس نے چاہا کہ بہو کو کچھ تسلی دے۔ لیکن زبان نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ بہو روئے جا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بہو کے آنسو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا اور وہ ایک لفظ بولے بغیر جلدی سے آگے بڑھ گیا۔
"تنک تنک تنا تائیں تائیں۔ عشق ہیں ــــــــــ"

ہُنہہ!

ہائے رات دو بجے آئے تھے۔ رونق میاں کی بیوی نے سوچتے ہوئے کھرے پلنگ پر پاؤں رگڑ ڈالے اور ایک طویل سرد آہ بھر کر اپنی جیٹھانی کی طرف دیکھا جو جلدی جلدی روٹی پکانے میں مصروف تھی۔

"یہ رنڈیاں........ اللہ توبہ ہے بھابی۔ بس ہانڈیاں کھانے کی ان کی عادت ہوتی ہے۔ حرامزادیاں کمائی کرنے سے ڈرتی بھی نہیں منہ کالا ہوگا مرتے وقت۔" اس نے کروٹ لے کر جیٹھانی کو مخاطب کیا۔ وہ بھی اتنے زور سے کہ اس کے پچھواڑے رہنے والی ہنڈیاں چھبیلی اور بسم اللہ سن لیں۔ جیٹھانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ وہ اٹھی اور پورا پلنگ دھوپ میں کھینچ کر پھر لیٹ گئی۔

رات رونق میاں دو بجے تک غائب رہے تھے اور غائب رہے تھے کہ

وجہ وہ خوب جانتی تھی، جس رات وہ دیر سے گھر آتے۔ تو ان سے تو کچھ کہنے سننے کی ہمت نہ ہوتی۔ بس رنڈیوں کو باتیں سنا کر دل ہلکا کر لیتی۔ بچے کو بغیر کسی بات کے دھول دھول پیٹ کر ڈال دیتی، کھانا نہ کھاتی شوہر سے منہ پھیر کر چاہتی۔ چپکے چپکے ٹسوے بہاتی۔ محلے ٹولے والیوں سے اپنی بپتا سناتی۔ لیکن رونق میاں کو جب غائب ہونا ہوتا ہو جاتے کوئی ان کا دامن تھامنے والا نہ تھا۔ ان سے تو اُف کرتے بھی اس کا دم نکلتا۔ بس لے دے کے رنڈیاں ہی غصے کا نشانہ بنتیں۔ مگر واہ ری بسم اللہ اور چھبیلی۔ کیا مجال جو کبھی ہزاروں باتیں سننے کے باوجود پلٹ کر آدھی بات کہہ جائیں۔ جیسے ان پر کچھ اثر ہی نہ ہوتا۔ شاید کانوں کی پٹم تھیں وہ، یا پھر اپنی اوقات سمجھتے ہوئے شریف زادیوں کے منہ لگنے کی ہمت ہی نہ رکھتی تھیں ؛

چھوٹا سا اجاڑ قصبہ۔ یہاں یہ تو نہ تھا۔ کہ رنڈیاں شریفوں سے دُور بہت دُور ——— اپنی دوکانیں سجا کر گناہ کا لین دین کریں۔
بلکہ یہاں تو چھبیلی اور بسم اللہ دس شریفوں کے محلے میں رہتیں ——— بہت دن ہوئے جب چھبیلی نے رونق میاں کی حویلی کے پچھواڑے پڑی ہوئی زمین اچھے داموں خرید کر یہ مکان بنوایا تھا اور جب وہ اپنی بیٹی بسم اللہ کے ساتھ اٹھ کر نئے مکان میں آئی تو جلد ہی کچھ کی آنکھوں کا نور، دل کا سرور بن گئی اور کچھ کے دل کا کھٹکتا ہوا کانٹا۔ عورتوں کو بسم اللہ اور چھبیلی کی وجہ سے سخت تکلیف ہوگئی تھی۔ جب سے وہ آکر رہی تھیں۔ ان کا

محلے میں آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ کہ کہیں رنڈیوں کا سامنا نہ ہو جائے۔ رنڈی کا سامنا ——— بس ہزار مردوں کے سامنے ننگے کھڑے ہونے کے برابر ہے۔ کہاں وہ کمائی کی کھانے والی رنڈیاں اور کہاں گھر بیٹھنے والی شریف زادیاں۔ رنڈیوں کا وہاں رہنا ایسا ہی تھا۔ جیسے فرشتوں پر شیطان کا سایہ۔ بیچاری گھر بیٹھنے والیاں۔ جو کمائی کے تصور ہی سے کانپ اٹھیں۔ توبہ تلا مچائیں۔ بھلا وہ کیسے گوارا کرتیں۔ کہ رنڈیاں ان کے محلے میں رہیں۔ جب ان کا دل چاہتا۔ اپنے گھر بیٹھے چیخ چیخ کر ان کی زندگی پر لعنت ملامت کیا کرتیں۔

ایک سال ہونے کو آیا۔ کہ چھبیلی شریف زادیوں کی لعنت ملامت سے کسی قدر محفوظ ہو چکی تھی۔ کیونکہ اس نے پنشن لے کر اپنے عہدے پر بسم اللہ کو فائز کر دیا تھا۔ جب چھبیلی کا وقت تھا تو وہ سچ مچ بڑی بانکی ترچھی چھبیلی تھی۔ اس نے اتنا کمایا اور مردوں کو ایسا نچایا کہ دُور دُور کے گاؤں کی کوئی رنڈی اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ لیکن بسم اللہ بھی تو آخر اسی کی اور سارے قصبے کی چھپے چوری کی مشترکہ اولاد تھی۔ اگر سب کا ایک ایک گُن بھی اسے ملا تو ماں سے کہیں بڑھ گئی۔

بس یہی وجہ تھی۔ کہ اس نے اپنے عہدے کو سنبھال کر جلد ہی ماں کی شہرت کو ماند کر دیا۔ ناچنے گانے کی وہ بڑی شوقین تھی۔ جب کسی تقریب میں اسے ناچنے کو بلایا جاتا۔ اور وہ اپنی بڑی بڑی صاف شفاف آنکھیں مٹکا کر کمر کو ہزاروں بل دیتے ہوئے اپنا "پیٹنٹ" گانا "ہائے ترچھی نجریا کے تیر"

گاتی تو سارا مجمع اس کے منہ سے نکلے ہوئے کبھی نظر نہ آنے والے تیروں سے گھائل ہو کر رہ جاتا۔ پھر جب ناچ ختم ہوتا۔ تو اسے اپنے اردگرد ڈھول سے اٹے ہوئے فرش پر پچاسوں چمکتے ہوئے سکے نظر آتے جو اس کی ہر ہر ادا پر نثار ہو کر نچھاور کئے جاتے تھے ؟

مجرے کا معاملہ طے کرنے میں وہ بڑی سخت تھی۔ ایسی کہ بلانے والے کے منہ سے پھچکر آنے لگیں۔ لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ بظاہر وہ مجرے کے ہی پیسے پر زندگی کاٹتی تھی۔ اس کے ہاں نہ تو آدمیوں کا بھیڑ بھبڑ رہتا اور نہ وہ کسی کے ہاں ملازمت کرتی تھی۔ لوگ اس کے ایسے سختی سے معاملہ طے کرنے پر بڑے پریشان ہوتے مگر کرتے بھی کیا ——— لے دے کے اس اجاڑ قصبے میں صرف دو ہی رنڈیاں تھیں۔ ایک ریٹائرڈ، چھوٹی آنکھ کے برابر اور دوسری اپنے عہدے پر کانے کی ایک عزیزہ زرین آنکھ کے موافق۔ پھر عہدہ بھی تو کوئی چیز ہے۔ اس کی جو قدر ہوتی ہے وہ ہر ایک خوب سمجھ سکتا ہے۔ اچھے اچھے لوگ عہدے داروں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے جوتے کے تلے تک گھس ڈالتے ہیں ——— بسم اللہ۔ چاہے کیسی ہی سخت شرائط پیش کرے۔ ماننے ہی بن پڑتی۔ ورنہ سچ بات تو یہ ہے۔ کہ قصبے اور گاؤں میں رنڈی نچائے بنا تقریب بالکل سونی ہی رہتی ہے۔ پھر بھلا سونا پن کسے ایک آنکھ بھائے۔ بسم اللہ کے خوب مزے رہتے۔

رونق میاں کی بیوی جو صبح سے دھوپ میں پلنگ ڈال کر پڑی تو

اٹھنے کا نام نہ لیا۔ جسم سے ساری دھوپ سرک گئی اور اسے سردی معلوم ہونے لگی۔ تو پھر پلنگ دھوپ میں کھینچ کر پڑ رہی۔ رات رونق میاں جو غائب رہے تھے۔ تو اس غم میں اس نے صبح سے ایک لقمہ منہ میں نہ ڈالا تھا۔ اس کی جیٹھانی نے کیسا کیسا اصرار کیا۔ کہ وہ کچھ کھا کر پانی پی لے۔ لیکن وہ ہر بار رو پڑی۔ کہ جب دل کو سکھ ہی نہیں تو پھر کھانا کھا کر کیا کرنا ہے؟ —— جیٹھانی بھی چپ ہو رہی۔ کہ سچ ہے دل کو سکھ ہو تو سب کچھ ہے، ورنہ کچھ نہیں۔ وہ تو اپنے جیسا دل سب کا سمجھتی تھی۔ بیچاری کب سے بیوہ بیٹھی جوانی کے کرموں سے دن رات گزار رہی تھی۔ نہ کوئی اچھی کا پوچھنے والا نہ بری کا؛

"اللہ قسم میرا بس چلے تو بھابی ساری دنیا کی رنڈیوں کو ہنڈیا سے کاٹ کر پھینک دوں۔ پھر کھاؤں کھانا" جیسے ہی اس کی جیٹھانی نے اس سے ہمدردی کی وہ بپھر کر کہنے لگی۔ اس کے دل میں تو جیسے آگ لگی ہوئی تھی؛

"ارے چپ بھی رہا کرو دلہن۔ کبھی کہ رنڈیاں تمہارے منہ لگیں۔ تو مفت عزت جائیگی" جیٹھانی نے آہستہ سے اسے سمجھایا۔ جانے کیوں اسے ڈر ہی لگا رہتا۔ کہ رنڈیاں جواب نہ دے بیٹھیں۔ کسی کو روز روز ستانا اچھا نہیں ہوتا؛

"ہُنھ! ہمیں جواب دیں گی۔ ان کی اتنی ہمت! کتوں کو کھلا دُوں بوٹیاں کر کے؟" وہ غصے سے سُرخ ہو کر بولی اور دُودھ پیتے بچے کو دھوں دھوں پیٹ کر کھرے پلنگ پر پھینک دیا۔ ویسے ہی اس نے

صبح سے ایک نوالہ نہ کھایا تھا۔ دودھ کہاں سے اُترتا؟ مگر اسے کیا مطلب؟ وہ تو بس سوتے سے اُٹھ کر۔ دودھ پینے میں جُٹ گیا۔ بھلا غصہ نہ آئے تو اور کیا ہو؟

"تم بھی تو ظلمی ہو۔ ناحق بچے کو پیٹ ڈالا۔ واہ کس کا غصہ کس پر اُترے۔" حد بھابی نے بچے کو اٹھا کر کندھے سے لگا لیا اور وہ دوپٹے سے منہ چھپا کر پھر لیٹ کر رونے لگی اور روتے روتے یہ وقت آ گیا۔ کہ دھوپ صحن اور دیواروں سے رنگینی ہوئی غائب ہو گئی۔

"ارے استاد جی۔ ہماری بسم اللہ کے لئے دودھ جلیبی لے آؤ جانے کب مجرے سے لوٹنا ہو تو بھوکی رہے گی۔ ارے ہاں، چاہے کوئی کھالئے نہ کھائے۔ اسے مل جائے"۔ شام کے اداس سناٹے میں چھبیلی کی آواز رونق میاں کی بیوی کے کانوں میں چُبھ گئی۔ جانے کیوں رنڈی کی آواز سے ہی اسے طیش آجاتا۔ وہ لیٹے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی اس کے ہونٹ مارے غصے کے کانپ رہے تھے۔

"بیڑا کمائی کرے اور اماں دُودھ جلیبی کھلا کھلا کر ــــــــ"

"اللہ اکبر"۔ قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آئی اور وہ بات ادھوری چھوڑ کر سر ڈھانکتے ہوتے جلدی جلدی دعائیں مانگنے لگی۔ یہ وقت دعاؤں کے قبول ہونے کا ہوتا ہے۔ نہ کہ رنڈی جیسی گندی چیز کا نام لے کر زبان خراب کرنے کا۔ وہ آنچل پھیلائے دعائیں کر رہی تھی۔ جانے کیا کیا۔ شاید اپنی زندگی سنوارنے اور رنڈیوں کے موت

آنے کی دعائیں ؛

جلیبٹھانی بھی چولھے میں آگ جلانے سے اٹھ کر وضو کرنے لگی۔ جب سے وہ بیوہ ہوئی تھی۔ پابندی سے نماز پڑھا کرتی۔ سچی بات تو یہ ہے۔کہ نماز بوڑھوں، بیواؤں، اور مولویوں کے حصّے کی چیز ہے مولوی نماز پڑھتا ہے، پیٹ بھرنے کے لئے، بوڑھا اپنی گور سے بدتر زندگی کے دن کاٹنے کے لئے اور بیوہ ——— بیوہ نماز پڑھتی ہے شیطان سے دور بھاگنے کے لئے۔ اس لئے وہ عرصے کبھی نماز قضا تک نہ کرتی اور پھر محلے والوں نے بھی اسے بیوہ ہونے کے بعد یہی صلاح دی تھی۔کہ بس اب اللہ سے لو لگاؤ۔ تمہارے لئے دنیا میں اور کچھ نہیں ؛

دعا ختم کرنے کے بعد اس نے اپنا بستر لگایا اور بچے کو جھولے سے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ معصوم جب سے پٹا تھا۔ سہما سوئے جا رہا تھا اور سوتے میں بھی بار بار سسکیاں بھر رہا تھا۔ مارے محبت کے اس کا دل امنڈنے لگا۔ اور وہ اس کے پاس لیٹ کر اسے سینے سے بھینچنے لگی ؛

کس کا غصہ کس پر اترا۔ بچے کو جگا کر اس نے منہ میں دودھ دے دیا۔ جلیبٹھانی نماز پڑھ کر کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔ جب سے اس کا شوہر مرا تھا۔ وہ جاڑوں میں ہمیشہ مغرب کے بعد ہانڈی چڑھاتی تو نو دس بجے تک کھانا تیار ہو جاتا اور سب کو کھلا پلا کر خود گیارہ بارہ بجے تک

کھاتی - اس کے بعد اس وقت تک آگ کے سہارے بیٹھی رہتی۔ جب تک کہ ننھے ننھے سُرخ انگارے راکھ میں تبدیل ہو کر سرد نہ ہو جاتے اس طرح جاڑوں کی طویل، دِل دہلانے والی راتیں کچھ جلدی کٹ جاتیں ؛

رات کے آٹھ بجے کے قریب رونق میاں اپنے گاؤں سے کام دیکھ بھال کر لوٹے تو یہ دیکھ کر ان کا جی جل گیا کہ بیوی ابھی سے لحاف کی قبر میں پٹی پڑی ہے۔ وجہ ان کو اچھی طرح معلوم تھی - پھر بھی وہ بیوی کی ایسی باتوں کو ڈھونگ سمجھ کر تپ جایا کرتے - آخر وہ ان کی بیوی تھی اسے تو بس اپنے کھانے، کپڑے، بچے کی پرورش اور شوہر کی مرضی سے مرضی رکھنا چاہیئے - نہ کہ ان کی باہر کی جا بے جا باتوں میں ہاتھ ڈالتی پھرے - یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی ان حرکتوں سے تنگ آکر ہفتوں بات نہ کرتے - وہ اس وقت بیوی سے تو کچھ نہ بولے - کھونٹی سے تہ بند اُتار کر کپڑے تبدیل کر کے باورچی خانے میں چلے گئے - آج شام سے کہرا پڑ رہا تھا - اس لئے سردی سخت ہو رہی تھی، وہ چولہے کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ سینکنے لگے - کھانا تیار تھا - بھاوج نے نکال کر سامنے رکھ دیا اور وہ کھانے کے بعد یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے - کہ نذیر احمد کے ہاں جا رہا ہوں دروازہ بند کر لینا ؛

تاش کی آٹھ دس بازیاں کھیل کر وہ ڈیڑھ گھنٹے بعد گھر لوٹے - تو دیکھا - کہ بھاوج بیوی کے سامنے کھانا لئے بیٹھی ہے - اور وہ نوالہ

ہاتھ میں لئے پُھسر پُھسر رو رہی ہے۔ بس جیسے ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"تم نے بھابی اسے اور بھی سر چڑھا لیا ہے۔ اُٹھا لے جاؤ کھانا۔" انہوں نے اپنے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"تم چپ رہو۔ ہاں؟" بھاوج پیار بھرے غصے سے بولی اور اسے کھلانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اس نے نوالہ سینی میں رکھ کر سینی آگے سے سرکا دی اور منہ لپیٹ کر رونے لگی۔

جیٹھانی نے کتنی مشکل سے تو اسے کھانے پر راضی کیا تھا۔ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ چپکے سینی اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

رونق میاں تھکے ہوئے تو تھے ہی۔ جلد ہی خراٹے لینے لگے اور وہ ان کے خراٹوں سے مطمئن ہو کر سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

رات کا اداس سناٹا۔ سسکیاں اور خراٹے، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی بڑا ہی عجیب سا ساز چھیڑ دیا گیا ہے۔ جس میں بیک وقت سکون و اضطراب کے ملے جُلے نغمے پیدا ہو رہے ہیں۔

"اری بسم اللہ۔ تو نے کھانا بھی نہ کھایا۔ اب دودھ ہی پی لے۔ پھر سوئیو۔ یہ مجرا تو تیرا کھانا پینا سب حرام کر دیتا ہے۔" سناٹے کو چیرتی ہوئی چھیبی کی آواز اس کے دل کے پار ہو گئی۔ اس نے کروٹ بدلی اور آنسو پونچھ کر سوچنے لگی۔ کہ افوہ ——— دنیا کی سب سے زیادہ خراب کمائی کے پیسے سے پیٹ بھرنے والی۔ اور اس کی یہ خاطر۔ صبح اُٹھتے

تو دودھ کا پیالہ ہونٹوں سے اڑا دیا جائے۔ رات سونے سے پہلے دودھ کا پیالہ منہ سے لگا دیا جائے۔ نہ پئے تو خوشامد کر کے پلایا جائے۔ اماں ہر وقت واری۔ استاد جی قربان۔ یاروں میں اچھے اچھے سیٹھ۔ ساہوکار نثار ہائے ——— اس نے سنا تھا۔ کہ جب بسم اللہ پیدا ہوئی تھی تو چھیلی نے بڑی خوشی منائی تھی۔ سارے قصبے کے جان پہچان والوں کی شاندار دعوت کی گئی۔ مسجد میں چراغ جلائے گئے تھے۔ لیکن وہ بدقسمت جب پیدا ہوئی تھی۔ تو سب سے پہلے اس کے باپ کو رنج ہو گیا تھا۔ کہ لڑکی کیوں ہوئی۔ اس نے اس رنج میں کئی وقت کھانا نہ کھایا تھا۔ اس کی ماں کو بھی رنج ہوا تھا۔ کہ اس کی جگہ لڑکا ہوتا تو اچھا تھا۔ خوشیاں بھلا کون مناتا اس کے بچپن میں کبھی ایسا نہ ہوا۔ کہ اس نے ملائی کی برف کھانے کو چار پیسے مانگے ہوں تو اسے روئے بغیر مل گئے ہوں اور پیسے دینے کے بعد اس کا باپ اس سے کتنے کام لے لیا کرتا۔ بیٹیا بھینس کے آگے بھوسا ڈال آ۔ اپلے ٹوکر ٹوکرے میں رکھ دے۔ ملو کی دکان سے دوڑ کر چار پیسے کا گڑ لے آ۔ اور ماں۔ وہ ——— کبھی ایک پیسہ نہ دیتی۔ لیکن سارا دن اس سے سارے گھر کا کام لیا کرتی۔

خیر۔ بچپن تو پھر بھی اچھا کٹ گیا۔ لیکن شادی کے بعد تو اس کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ جب تک ساس زندہ رہی۔ رات دن کچو کے لگاتی رہی۔ اس سے چھٹکارا ملا تو نندوں نے جوان ہو کر ادھم ڈھانا شروع کیا اور اس وقت تک اسے کھاتی رہیں۔ جب تک کہ اپنے گھر کی نہ ہو گئیں۔ پھر اس نے

سوچا کہ زندگی اب اچھی گزرے گی۔ کوئی اسے کھانے چبانے والا نہیں۔ مگر شوہر نے اٹھتے بیٹھتے گھرکی سے کام لینا شروع کر دیا۔ شادی کے چند ہی سال بعد سارے چونچلے ختم ہو گئے۔ اگر وہ ذرا منہ سے اُف کرے تو گھر سے نکالنے کی دھمکی۔ ——— چچ چچ۔ اس سے تو اچھی رنڈیاں وہ عیش تو کرتی ہیں۔ اور ——— وہ سوچتے سوچتے چونک پڑی۔

"توبہ ہے۔ یا اللہ توبہ ہے" ——— اس کے لب آہستہ سے ہلے۔ اور اپنے گالوں پر ہولے ہولے ہاتھ مارا۔ کیسا غضب ہوا۔ کہ اس نے رنڈی سے اپنا مقابلہ کیا؟ یہ سب شیطان کے کارنامے ہیں ورنہ ——— ورنہ کہاں وہ گھر بیٹھنے والی شریف زادی جو کمائی کے خیال ہی سے کانپ اٹھے۔ رنڈی اس سے اچھی ہو سکتی ہے؟ اگر وہ دنیا میں عیش کر لیتی ہیں۔ تو کیا ہوا۔ خدا کے ہاں تو دوزخ کا کندہ بنیں گی اور وہ ——— وہ جو مصیبتیں جھیل رہی ہے دنیا کی تو کیا ——— مرنے کے بعد تو جنت کے دروازے پاٹوں پاٹ کھلے ہونگے اس کے لئے ——— توبہ توبہ۔ خدا اسے بُری باتوں سے بچائے اور ——— رونق میاں نے کروٹ بدلی اور اس نے اپنا منہ جلدی سے لحاف کے اندر کر لیا۔ اب وہ بار بار کروٹیں بدل رہے تھے۔ جیسے نیند اچاٹ ہو رہی ہو۔

"کیا جاگ رہی ہو"؟ انہوں نے ہنکے سے آواز دی۔

"ہوں"۔

"میں نے کہا۔ سونے سے آنکھ کھل گئی اور اب نیند نہیں آرہی ہے ذرا پاؤں دبا دو"۔

آج رات انہوں نے بہت دنوں بعد پاؤں دبانے کو کہا۔ لیکن اس نے جواب تک نہ دیا۔ جیسے وہ اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کر کے انہیں منانے کی دعوت دے رہی ہو۔ پھر بھی وہ دل میں خوش تھی۔ بہت خوش۔ کہ اس سے پاؤں دبانے کو کہا گیا۔

"سنا نہیں تم نے؟" انہوں نے جواب نہ پا کر غصے سے کہا اور اسکی خوشی رفو چکر ہو گئی۔ وہ تو منانے کی دعوت دے رہی تھی۔ نہ کہ غصے ہونے کی۔

"میں نہیں دباؤں گی۔ جب تم میرے نہیں تو کیوں خدمت کروں؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور سمجھا کہ اب ان کا دل موم ہو جائیگا اور آخر وہ اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی تو کیا ہوا۔ اس وقت ان کی اس سے غرض بھی تو اٹکی ہوئی تھی۔

"تم ——— تم کیا۔ ——— تمہارے باپ دبائیں گے پاؤں"۔ وہ غصے سے بیٹھ کر بولے۔ "ہاں سمجھیں۔ نہیں تو اپنے گھر کا راستہ لو"

"گھر کا راستہ کیا لیں۔ تم ہی مار کر چھٹی کر دو"۔ وہ رونے لگی۔

"ہمیں کیا پڑی ہے۔ جو اپنے ہاتھ گندے کریں تم کو مارنے میں"۔ وہ پھر لیٹ گئے۔ اور پاؤں اینٹھا اینٹھا کر چھت کی کڑیاں گھورنے لگے۔

"چلو بس ہو چکا رونا۔ پاؤں دبا دو۔ اٹھو تو جلدی سے" انہوں نے کہا

کبھی کل انہیں چین ہی نہ پڑ رہا تھا پاؤں جو اینٹھ رہے تھے بہت ۔ وہ چپکے سے اُٹھ کر سردی میں سسیاتی پائینتی بیٹھ گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس وقت اپنی اور ان کی جان ایک کر دے ۔ یہ بھی کوئی زبردستی ہوئی کہ ظالم مارے اور رونے نہ دے ۔

" لحاف ڈال لو اپنے اوپر ۔ سردی لگ رہی ہو گی" ۔ انہوں نے ملائمت سے کہا ۔ اور وہ جو اپنی اور ان کی جان ایک کر دینے کے منصوبے باندھ رہی تھی ۔ محسوس کرنے لگی ۔ کہ اس کا دل خوشی سے دھڑک رہا ہے ہاتھ اُلٹے سیدھے پیروں پر پڑ رہے ہیں ۔ جسم کا رواں رواں ایک نہ معلوم جذبے سے کانپا جا رہا ہے ۔ اُفوہ ——— پاؤں دبانا ۔ جیسے عورت کا فطری حق ہو گیا ہے ۔ اگر اس سے نہ دبوائے جائیں ۔ تو کیوں نہ سارے جہان کا غم اس پر پھٹ پڑے ؟ بھلا اس کا شوہر اور اسی کی خدمت سے محروم رہے ۔ پھر کیسے جئے کوئی ؟

چار دن سے وہ بہت خوش تھی ۔ بات بات پر اس کے دانت نکلے پڑتے ۔ لیکن آج ——— آج پھر رونق میاں رات کے دو بجے تک غائب رہے تھے ۔ اور وہ صبح سے دھوپ میں پلنگ ڈالے پڑی رو رہی تھی ۔ جیٹھانی نے کیسا کیسا سمجھایا ۔ کہ یوں روز روز غم کرنے سے ایک دن جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا ۔ لیکن اس نے کچھ نہ سنا ۔ شریف زادی ہو تھی وہ ۔ اور شریف ہمیشہ رو کر زندگی کاٹتا ہے ۔۔

" اری بسم اللہ ۔ صبح کی بھوکی پڑی ہے ۔ کچھ تو کھا ۔ لے رجا نے لطیفے

دل تجھے کیا ہو جاتا ہے۔ جو چپکی منہ لپیٹے پڑی رہتی ہے۔" چنبیلی کی تیز آواز اس کے کانوں میں اتر گئی۔ اور وہ جیسے بلبلا کر اُٹھ بیٹھی۔ وہ بھی تو آخر صبح سے بھوکی تھی۔ تو اس کے میاں نے ایک دفعہ بھی اس سے کھانے کی خوشامد نہ کی۔

"رنڈیوں کے چونچلے ——— وہ چیخ پڑی ——— کمائی کے پیسے سے پیٹ بھرنے والیاں اور یہ ٹھسّے"۔ ——— اس کا تو سارا غصہ بس رنڈیوں ہی پر اترتا۔ لیکن اس سے کوئی پوچھے کہ غریب رنڈیوں کی کیا خطا ——— ؟ مگر وہ تو انصاف کے نام سے ہی واقف نہ تھی۔ رنڈیوں کو باتیں سنا سنا کر شیر ہو رہی تھی۔ منہ کالا ہو گا۔ بدمعاشوں کا خوب ———

"کمائی ——— بس جی بس بہت سنا ہم نے"۔ ایک غصے سے بھرائی ہوئی آواز سن کر وہ گھبرا گئی۔ اور جیسے ہی اوپر نگاہ اٹھی۔ تو دیکھا۔ کہ بسم اللہ غصے سے لال بھبوکا اپنی چھت پر کھڑی اسے گھور رہی ہے۔

رنڈی کا سامنا ——— غضب ——— اس نے اپنا منہ دوپٹے کے پلّو سے چھپا لیا۔ اور جلبیھا تی بھی صحن سے ہٹ کر دالان میں دبک گئی۔

"تیری یہ ہمت کمینی! کمائی کی کھانے والی۔" وہ جھنجلا کر چیخی۔

"ہوں۔ کمائی کی کھانے والی ——— بسم اللہ نے ہاتھ مٹکا کر

اس کی نقل اتاری ——— بی بی جس کمائی کے پیسے سے ہم پیٹ بھرتے ہیں۔ اسی سے تم بھی اپنا پیٹ بھرتی ہو۔ اور تم ——— تم کیا دنیا کی سب عورتیں اسی کا کھاتی ہیں۔ جس کا ہم۔ پر تم ہمیشہ جوتیاں سیدھی کرتی رہتی ہو اور ہم سر چڑھ کر کھاتے ہیں۔ کسی کے دبیل نہیں۔ سمجھیں کیا کہتی ہو ہم کو۔ کمائی کے پیسے سے پیٹ بھرتی ہے۔ کمائی کے پیسے سے۔ جب جانیں۔ تم لے لو اپنے میاں سے یوں ہی روٹی کپڑا۔ بڑی بیچاری ہم کو کہنے چلی ہیں۔ مچھلی کے سے سفلے اکھیڑ کر رکھ دوں۔ جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔ ہاں؟۔

بسم اللہ نے ایک ہی سانس میں اتنی باتیں سنا ڈالیں اور چھبیلی اسے زبردستی دھکیلتی ہوئی نیچے لے گئی۔ محلے میں لڑائی کی آواز سن کر بہت سے آدمی جمع ہو گئے تھے۔ جو جلدی جلدی بسم اللہ کو سمجھا رہے تھے۔ اور وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔ کہ اتنے دن سے سنتے آ رہے ہیں باتیں۔ پر کچھ نہ بولے ادھر رونق میاں کی بیوی جو رنڈی کے بے عزتی کرنے سے بالکل مبہوت ہو رہی تھی۔ ایک دم چیخ چیخ کر رونے لگی۔ کہ رنڈی کا اس سے سامنا ہو گیا بڑی مشکل سے جیٹھانی نے سمجھا بجھا کر چپ کیا۔

شام کو رونق میاں گاؤں سے واپس آئے تو باہر ہی لڑائی کا حال معلوم ہو گیا۔ گھر آتے ہی بیوی کے دو تین ہاتھ جما دئے۔ بھلا کوئی بات بھی تھی کہ رنڈیوں کے منہ لگا جائے۔

اس دن اس نے رات کو بھی کھانا نہ کھایا اور چپکی سنہ لپیٹ کر پڑ رہا

اسے شوہر کے ہاتھوں کی مار کا اتنا رنج نہ تھا۔ جتنا زندہی کی باتوں نے اسکے دل کو تکلیف پہنچائی تھی۔ آخر یہ اس نے کیسے کہہ دیا۔ کہ جس طرح وہ اپنا پیٹ بھرتی ہے اسی طرح وہ بھی۔ اس کا بس چلتا تو اس بات پر وہ بسم اللہ کی زبان کھینچ کر پھینک دیتی۔ مگر ہائے مجبوری۔

"اری بسم اللہ۔ اٹھ جا کھانا کھالے۔ تو کیوں رنج کرتی ہے۔ کہنے والوں کو کہنے دے۔ پر ہم تو یہی کہیں گے کہ جو چاند پر تھوکے گا الٹا منہ پر پڑیگا۔" چھبیلی کی چیختی ہوئی آواز آئی۔ اور وہ جیسے تڑپ اٹھی۔

"منہ سڑے کہنے والی کا" ———— وہ بدبدائی ———— "ہم کمائی کے پیسے سے پیٹ بھرتے ہیں۔ بدمعاش۔ زنڈی۔ کمائی تو صرف یہی کر کے پیٹ بھرتی ہے۔ وہ شریف زادی ہے، شریف زادی ——— زنڈی ———— ہنہہ۔

چپکے چپکے

کچھ ماہ اِدھر یا اُدھر، کوئی تیرہ چودہ کے سن سے بابوجی نے وہ گھنی گھنی عیاشیاں کیں کہ کتے کوّے بھی گھن کھائیں۔ ان کے باپ جبھی مر گئے تھے جب وہ دو سال کے تھے۔ رہ گئی غریب ماں تو بھلا لڑکوں پہ زور ہی کیا چلتا ہے۔ بس غم سہتی رہی اور گھل گھل کر آخر ایک دن اللہ کو پیاری ہو گئی لیکن بابوجی کو نہ سنبھلنا تھا نہ سنبھلے۔ حال یہ تھا۔ کہ جس طرح کھانا پینا اور ضروریات سے فارغ ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ اسی طرح روز کوئی نہ کوئی سڑی سی بدمعاشی کرنا بھی ضروریاتِ زندگی میں سے سمجھتے تھے۔ محلے کی لڑکیاں ان کے نام سے کانپتیں اور لڑکے پناہ مانگتے تھے۔ محلے والے انہیں سمجھا سمجھا کر تھک گئے پر توبہ —— کہیں چکنے گھڑے پر پانی کی ایک بوند بھی ٹھہرا کرتی ہے۔ —— کوئی تیس سال کی

عمر تک جو دل چاہا وہ کیا۔ پھر جو سنبھلے ہیں تو حیرت انگیز طریقے پر ـــــــ باپ کی جمع کی ہوئی دولت تو وہ پہلے ہی نہ جانے کس کس کی نذر کر چکے تھے۔ اب نوکری کی فکر ہونے لگی۔ وہ تو کہو۔ کہ بابو جی سمجھ کے معاملے میں ذرا تیز تھے۔ جو ماں کے کہے سُنے میٹرک کر لیا تھا۔ ورنہ شریف بننے کا بدلہ یہ ہوتا کہ انہیں ڈلیا ڈھونا پڑتی۔

لگاتار دو ماہ سخت دوڑ دھوپ کرنے کے بعد ایک دفتر میں تیس روپے کے کلرک کی حیثیت سے جگہ مل گئی اور بابو جی کو کھانے پینے کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ دفتر جانا اور باقی وقت محلے کے بزرگوں کی پند و نصائح کے سائے میں گزارنا۔ ادھر محلے والوں کو دوسری ہی فکر ہوئی۔ یعنی بابو جی کو شرافت کے دائرے میں اچھی طرح قید کرنے کے لئے ان کی شادی کی فکر کرنے لگے۔ بابو جی نے سعادت مندی سے بہت چاہا کہ پیچھا چھڑا لیں لیکن جناب یہ محلے والے ـــــــ بس کوئی انہیں اپنا بزرگ سمجھ کر سر جھکا بھی دے۔ تو ان کے پو بارہ ہو جاتے ہیں۔ آخر بابو جی کو شادی کی زنجیروں میں جکڑ کر مانے۔ حالانکہ وہ سب یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ بابو جی شادی سے بھاگتے ہیں تو ازدواجی زندگی کبھی اچھی نہ گزرے گی۔ مگر وہاں اس کے برعکس ہوا۔ وہ بابو جی۔ جو شادی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے۔ بیوی کی محبت میں دیوانے رہنے لگے۔ دیکھنے والے دیکھتے۔ اور ان کی محبت پر رشک کرتے۔ محلے کی عورتیں جب اپنے میاؤں سے کبھی لڑتیں تو رو رو کر مثال پیش کرتیں کہ بھلا تم کیا چاہو گے مجھے۔

چاہت تو وہ ہے۔ جو بابوجی کو اپنی بیوی سے ہے۔ اور جب مائیں اپنی بیٹیوں کی شادی جیسے اہم مسئلے کا حل سوچتیں تو آنچل پھیلا پھیلا کر دعائیں کرتیں۔ کہ خدایا میری بیٹی کو بھی بابوجی جیسا شوہر عطا کرنا۔ اور بھلا کیوں نہ ہوتیں ایسی دعائیں ——— ؟ کونسا ایسا عیش تھا۔ جو بابوجی کی بیوی کو میسّر نہ تھا۔ بابوجی اپنی جان پر دُکھ سہتے۔ لیکن بیوی کو اچھے سے اچھا پہناتے اُڑھاتے۔ بیوی نے ذرا اُوں۔ آں کی اور بابوجی نے اللہ آمین منائی۔ ڈاکٹر حکیم آنے شروع ہو گئے۔ بستر پر سیدھی لٹا دی گئیں۔ بابوجی نے پائینتی پکڑی اور سر تو خیر مقدّس چیز ہے۔ پاؤں تک دبانے میں گریز نہ کیا۔ اپنے ہاتھ سے پرہیزی کھانا پکانا۔ دواؤں کے لئے دوڑنا اور بیوی کی بیماری کے صدمے سے بے ہوش ہو جانا لیکن ایسی خدمت اور محبت کے باوجود بیوی کا منہ کبھی سیدھا نہ ہوتا۔ جب دیکھو سؤر کی طرح لٹکا ہُوا ہے۔ چُپکے چُپکے رویا جا رہا ہے۔ خواہ مخواہ غریب بابوجی کو سینکڑوں باتیں سنائی جا رہی ہیں۔ لیکن محبت ہو تو ایسی کہ کبھی منہ سے اُف نہ کرتے ؛

یہ وہی بابوجی تھے۔ جنہوں نے ایک بار غصے میں اپنی ماں پر لکڑی اٹھا دی تھی۔ سارے محلے نے تھو تھو کی کہ شریفوں کے گھر ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ جنت نصیب کرے مرحومہ کو مرتے مرتے بیٹے کی زبان اور پیسے کا سُکھ نہ دیکھ سکی۔ دیکھتی بھی کیسے ——— سارا سُکھ تو بیوی کی قسمت میں لکھا ہُوا تھا۔ لیکن بابوجی کو ماں کے ستانے کا بدلہ

بھی مل گیا ۔ بیوی ایسی ناشکری ملی ۔ کہ جن لوگوں نے بیچ میں پڑ کر شادی کرائی تھی ۔ انہیں نماز کے بعد کوسنوں سے یاد کرتی ۔ بابوجی کو جو دل میں آتا کہہ ڈالتی ۔ کبھی خدا کا شکر ادا نہ کیا کہ ایک ایک ٹکڑے کو محتاج تھی ۔ ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے ۔ پھوپھی کی جوتیاں سیدھی کیا کرتی ۔ چاند سی صورت پر چھیٹ کپڑے پہنے پھرا کرتی اور اب سارے دلدر دور ہو گئے ۔ مگر یہ باتیں اس کی سمجھ میں کب آئیں محبت کرنے والا میاں جو ملا تو دماغ خراب ہو گیا ۔ لیکن بابوجی تھے ۔ کہ محبت و خدمت سے باز نہ آتے ۔ بیماری میں تو وہ جو کچھ خدمت کرتے وہ تو خیر گھاٹے میں تھی ویسے بھی ان کا یہ حال تھا ۔ کہ دفتر سے آئے اور بیوی کو گھر کے تمام بکھیڑوں سے سنجات دلا کر اپنے پاس بٹھا لیا ——— کبھی گورے گورے ہاتھ سہلائے جا رہے ہیں ۔ کبھی بازوؤں پر ہاتھ پھیرا جا رہا ہے اور کبھی پیشانی پر آئے ہوئے بال سنوارے جا رہے ہیں ۔ بیوی آرام سے بستر پر دراز ہے ۔ آپ بیٹھے ہیں ۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کی جا رہی ہیں ۔ اور بیوی صاحبہ ہیں ۔ کہ ایسے وقت میں بھی ٹھنڈی سانسیں بھر رہی ہیں ۔ آپ ہی آپ اینٹھی جا رہی ہیں ۔ ہاتھ جھٹکا جا رہا ہے ۔ تیوری پر بل پڑے جا رہے ہیں ۔ کھانا کھانے کا وقت آیا تو بابوجی خود ہی جھپٹ کر نکال لاتے ۔ قسمیں دے دے کر زیادہ سے زیادہ کھلانے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ ایک ہاتھ میں پنکھا لئے ہلاتے بھی جاتے ہیں ——— بھلا کونسا شوہر اپنی بیوی سے ایسی محبت کرے گا ——— ؟

بڑے بڑے محبت کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ کہ بیوی سے جوتے کھا
کرانے سے بھی نہیں چوکتے۔ جو بات کہہ دی اس پر اڑ کر رہ گئے۔
غریب بیوی منہ سے اُف نہیں کر سکتی لیکن بابو جی کی بیوی ——
افوہ! جو کچھ منہ سے کہہ دیں۔ ان کے لئے خدائی حکم ہو جاتا۔ ان پر
بھی بیوی کا منہ نہ سیدھا ہو تو یہ اس کی بدنصیبی ——
بعض محلے والیوں کا تو یہ خیال تھا۔ کہ بابو جی کی بیوی نے ضرور کسی کو
تاک رکھا ہوگا۔ جبھی ان سے خوش نہیں رہتی۔ بعض کا خیال تھا۔ کہ اولاد
نہ ہونے کی وجہ سے رنجیدہ رہتی ہوگی۔ بعض کہتے کہ بانجھ ہوگی۔ ورنہ اولاد
تو تو مہینے کے بعد ہی سامنے آجاتی ہے۔ اور اس کمبخت کی شادی کو
دو سال ہو گئے۔ ایک بھنگا بھی نہ پیدا ہوا۔
یہ سب کا اپنا اپنا خیال تھا۔ ورنہ بابو جی کی بیوی کو تو کبھی بچے کچے کا
خیال بھی نہ آتا تھا۔ اور جو کچھ اس کے دل میں ہو وہ خدا ہی بہتر جانے۔ کچھ
ایسی گھُنّی تھی۔ کہ کیا مجال جو کسی کو اپنے دل کا بھید دے دے۔ محلے والیوں
سے تو وہ خار ہی کھاتی۔ ملنے تو وہ سب اس سے آتیں۔ لیکن تعریف کرنے
بیٹھ جاتیں بابو جی کی۔ بھلا جی جلنے والی بات ہے کہ نہیں؟ یہی وجہ تھی
کہ وہ کبھی ان سے سیدھے منہ بات نہ کرتی۔
بابو جی کی بی ہمسائی کو ان کی بیوی سے سخت نفرت تھی۔ اور وہ ہمیشہ اس
بات پر تیار رہتی کہ کب بابو جی اپنی بیوی کو چھوڑیں اور وہ اپنی نازوں پلی
حسین بیٹی ان کو دے دے۔ اگر انہوں نے کبھی عیاشی کی بھی تو کیا ہوا

سبھی کرتے ہیں مقدر کی بہت۔ جوانی ہوتی ہی ہے دیوانی۔ بس برائی یہ ہوئی۔ کہ بابوجی نے بچپن ہی سے جوانی کی رنگ رلیاں منانا شروع کر دی تھیں اور حد سے بھی گزر گئے۔ ورنہ جوانی میں اعتدال کے اندر جو چاہتے سو کرتے۔ پھر کس کے منہ میں اتنے دانت تھے۔ جو کچھ کہنے کی ہمت کرتا پھر پہنچی بات۔ تو یہ ہے۔ کہ جب سے بابوجی سنبھلے سبھی کو ان سے محبت اور ہمدردی ہو گئی۔ کیا مجال جو کسی لڑکے یا لڑکی کو نظر بھر کر دیکھیں۔ یا محلے والوں کے آڑے بیڑے میں خود حصہ نہ لیں۔ ایسی حالت میں اگر سب کو ان سے ہمدردی ہوتی تو کیا گناہ ـــــــــــــ؟

محلے والیاں بابوجی اور ان کی بیوی کے عیش سے کچھ ایسی متاثر تھیں۔ کہ جب ان کے گھر سے آتیں تو گھنٹوں وہیں کا ذکر رہتا۔

"بابوجی کی بیوی دل کی پیاس کا جوڑا پہنے تھی۔"

"ارے میں کہتی ہوں۔ کہ گھر میں اچھے اچھے امیر ایسے ٹھاٹھ نہ کرتے ہوں گے۔"

"اور اس بار تو سونے کے نئے کڑے بھی پہنے ہوئے تھی۔ جانے بابوجی اتنا پیسہ کہاں سے لاتے ہیں۔ سنا ہے۔ کہ بہت قرضہ ہو گیا ہے"

"خیر کچھ بھی ہو۔ یہ دیکھو کہ بیوی سے محبت کیسی ہے۔ میں ہوتی۔ تو عمر بھر پاؤں دھو دھو کر پیتی۔"

غرض اس قسم کی اور پچاس باتیں۔

باہر بابوجی کے دوست انہیں چھیڑتے۔ مجنوں جیسی محبت پر طنز

کرتے۔ دوستوں سے دُور رہنے پر شکایتیں کرتے۔

"یار تم زن مرید ہو کر رہ گئے۔ کبھی ہم کو بھی صورت دکھا دیا کرو۔" کوئی دوست کہتا۔

"تم جانو دفتر سے آنے کے بعد پھر فرصت ہی نہیں ملتی"۔ بابوجی صفائی پیش کرتے۔

"اور یہ بھابی گڑک کیوں ہیں۔ ہم تو مٹھائی کے کب سے امیدوار ہیں۔" کوئی دوست بیوی تک پر پھبتی کسنے سے نہ چوکتا۔

"ارے کھا لینا مٹھائی۔ جب اللہ کی مرضی ہو۔" بابوجی سر جھکا کر کھیسیں نکال دیتے۔

بابوجی کی شادی کو چار سال ہو گئے۔ لیکن بچہ نہ ہُوا۔ اس کا ملال اس قدر محلے والوں کو ہُوا۔ کہ ٹھکانا ہی نہیں۔ عورتیں صاف کہہ دیا کرتیں کہ بیوی بانجھ ہے۔ اب بچہ نہ ہو گا۔ ہائے افسوس کہ بابوجی کے بعد ان کے گھر کا مالک کون ہو گا۔ نسل مٹ گئی۔ یہ باتیں اُڑتے اُڑتے بابوجی کی بیوی کے کان میں پڑیں۔ اور جیسے وہ بلبلا اُٹھیں۔ روتے روتے آنکھیں سجا لیں۔ ان لوگوں کو آنچل پھیلا کر کوسنے دیئے۔ جنہوں نے بیچ میں پڑ کر شادی کرائی تھی۔ اپنے لئے بھی کتے کوّوں کی آئی ہوئی موت مانگی۔ اور تین دن تک بابوجی سے رات دن لڑ کر ایک کر دیا۔ لیکن شاباش ہے ان کو۔ پکڑے ہوئے لٹیا چور کی طرح سامنے گھگیا تے رہے۔ اور جب ذرا لڑائی ختم ہوئی تو بیوی کو ایک نازک سی سونے کی

Scanned with CamScanner

انگوٹھی لادی - اور سمجھ لیا - کہ اب اسے اپنا غلام بنا لیا ہے - مگر جناب وہاں معاملہ برعکس ہؤا - رنجیدگی بڑھتی ہی گئی - اور آخر کار رنج وغم نے بیماری کی صورت اختیار کر لی - حکیم ڈاکٹر آنے لگے - بابوجی دواؤں کے لئے دوڑنے لگے - لیکن بیوی کی حالت گرتی ہی گئی - وہ بیچارے پہلے ہی بیوی کے غم میں برابر کے شریک رہ کر آدھے گھُل چکے تھے - اب اس کی بُری حالت دیکھ بار بار غشی کے دَورے پڑنے لگے - ایسے بُرے وقت میں انہوں نے چاہا - کہ گھر کا کام کرنے کے لئے کوئی عورت مل جائے مگر وقت پڑے پر تو جیسے ہر چیز عنقا ہو جایا کرتی ہے - محلے والوں کی کوشش کے باوجود کوئی عورت نہ ملی - اور انہوں نے ایک لڑکے رحیم نامی کا انتظام کر دیا ۔

رحیم تھا بالکل جوان - بابوجی اسے زنانے میں رکھتے بڑے ہچکچاتے - لیکن یہ وقت ایسا نہ تھا - ان کی چاند جیسی بیوی تو پلنگ پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھی - اس کے سرہانے بیٹھے بابوجی چولہا ہانڈی کرتے - آخر اسے رکھنا ہی پڑا ۔

کہنے کو تو رحیم غیر تھا - لیکن نہ جانے خدا نے اس کے دل میں کونسا رحم کا جذبہ پیدا کر دیا تھا - کہ سارا دن دوڑ دوڑ کر کام کیا کرتا - کیا مجال جو ذرا ناک بھوں چڑھائے - ادھر بابوجی دوا لینے گئے اور اس نے سب کام چھوڑ چھاڑ بابوجی کی جگہ پُر کر دی - اپنی مالکن کے سرہانے گھنٹوں سر دبایا کرتا اور اس وقت تک نہ ہٹتا جب تک وہ زبردستی اس کے ہاتھ

نہ ہٹاو نہیں ۔ سچ بات تو یہ ہے ۔ کہ رحیم نے اس کی اس قدر خدمت کی ۔ کہ کوئی اپنا سگا بھی نہ کرتا ۔

خدا خدا کر کے تین ماہ بعد بابو جی کی بیوی ذرا تندرست ہوئیں اور بابو جی کو جیسے دنیا بھر کی دولت مل گئی ۔ لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا ۔ کہ جوں جوں بیوی تندرست ہو کر خوش رہنے لگیں ۔ وہ مغموم و متفکر سے نظر آنے لگے ۔ حالانکہ انہیں تو خوش ہونا چاہیئے تھا ۔ کہ وہ بیوی جس کا منہ ہمیشہ سُوجا رہتا اب خوشی سے کھلی رہتی ۔ مُردہ سی چال میں چستی آگئی تھی ۔ آنکھیں تارہ سی روشن ہو گئی تھیں اور کام کاج کرنے سے جھنجھنانے کے بجائے ہر وقت رحیم کا ہاتھ بٹانے لگی تھی پھر رنجیدگی کا سبب ________ ؟

بابو جی جب دفتر سے واپس آتے اور دیکھتے کہ بیوی کام میں رحیم کا ہاتھ بٹا رہی ہے ۔ تو نہ معلوم کیوں اور کبھی غمناک ہو جایا کرتے ۔ کپڑے تبدیل کر کے دھڑام سے پلنگ پر گر جایا کرتے اور حسرت سے باورچی خانے کی طرف دیکھا کرتے ۔ لیکن وہ ہر طرف سے بے خبر ________ بس رحیم کے کام میں پھرتی سے ہاتھ بٹایا جا رہا ہے ۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قریب رکھے ہوئے پاندان سے پان کھائے جا رہے ہیں ۔ رحیم کے ہونٹ بھی رچائے جا رہے ہیں ۔ وہ ہے کہ کچکچا کر پان چبا رہا ہے ۔ اور اگر بابو جی کا خیال آگیا تو ایک پان ان کو بھی رحیم کے ہاتھ بھجوا دیا گیا ۔ بابو جی پان تو خیر لے لیتے لیکن کھانے میں بھلا کیا مزہ آتا ۔ جبکہ ان کے حصے کے پان کمبخت رحیم ہڑپ کر جاتا ۔ اُوہ ________ انگاروں پر لوٹتے وہ رحیم کے

Scanned with CamScanner

رچے ہونٹ دیکھ کر۔ لیکن وہاں مزے سے باتیں ہوتیں ۔

"میرا بس چلے تو تم کو کام نہ کرنے دوں"۔ وہ رحیم کے آگ سے تپتے ہوئے عنابی چہرے کو پیار سے دیکھ کر آہستہ سے کہتی ۔

"ایک دن میں نکال دیں بابوجی"۔ رحیم لیٹے ہوئے بابوجی کی طرف اشارا کرتا ۔

"ہنھ! دیکھا نہ ہوا ان کو بڑے ۔ مجھ سے اکیلے کام ہونے سے رہا۔ روز روز کی تو بیمار رہوں۔" وہ غرور سے سر اونچا کر کے نفرت سے منہ بناتی ۔

"میں تو غلام ہوں آپ کا۔"

"مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے۔" خوشی سے اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ۔

"تم یہاں آؤ جی۔" بابوجی دونوں کے بھنبھنانے کی آواز سے تڑپ کر پکارتے ۔

"آخر کام کیا ہے؟" وہ اٹھلاتی ہوئی ان کے پاس آجاتی ۔

"یہاں بیٹھو۔ میرے پاس ٹھنڈک میں۔ وہاں آگ کے سامنے طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

"مجھے ٹھنڈک کی ضرورت نہیں ۔ وہاں ذرا کام کاج میں دھیان بٹا رہتا ہے۔" وہ کُڑھ کر کہتی ۔

"چولھے کے پاس تمہارا دھیان بٹتا ہے اور میری باتوں سے نہیں" وہ تلملا کر کہتے ۔

Scanned with CamScanner

"تمہاری باتیں" ———— وہ ایک دم بھڑک اٹھتی ————
"تمہارے پاس باتیں ہی کیا رکھی ہیں ———— وہی آئی گئی، اب کی تنخواہ میں یہ لادوں گا۔ جب کی تنخواہ میں وہ لادوں گا۔ آج چار سال سے یہ باتیں سنتی چلی آرہی ہوں۔ آخر کبھی اکتاؤں گی بھی یا نہیں ———— ؟"

"ارے میں کب کہتا ہوں۔ کہ تم دل نہ بہلاؤ" ———— وہ دب کر کہنے لگتے "مگر دیکھو میرے کہنے کا مقصد تو یہ ہے۔ کہ رحیم کو زیادہ سر نہ چڑھاؤ۔ آخر نوکر ہے۔"

"بھلا اس میں برائی کیا ہے۔ نوکروں سے ذرا سیدھے منہ بولو۔ تو دو کام زیادہ ہی کر دیتے ہیں" وہ ہنستی ہوئی پھر باورچی خانے میں دھواں کھانے گھس جاتی۔

"خدایا ———— تو موت دے دے رحیم کو" ———— بابو جی بلک کر کوسنے۔ بالکل چپکے چپکے۔ بے کس عورتوں کی طرح۔

بیوی کی خوشیاں بڑھتی گئیں۔ اور بابو جی غم سے پاگل رہنے لگے۔ آخر محلے والوں کو بھی فکر ہوئی تو یہی۔ کہ بچہ نہ ہونے کی وجہ سے انکا یہ حال رہنے لگا ہے۔ اور پھر منحوس روتی صورت بیوی کا ساتھ۔

"میاں آخر تم دلہن کا علاج کیوں نہیں کرتے۔ گود بھرے تو تم لوگوں کا دل ٹھنڈا ہو" ایک دن محلے کے ایک بزرگ نے ان کو سمجھایا۔

"جی اب ارادہ ہے۔ کہ اسی کا علاج کروں" بابو جی نے انتہائی سعادت مندی سے سر جھکا دیا۔ اور پھر ان بزرگ نے انہیں ایک پیر صاحب قبلہ کا پتہ

Scanned with CamScanner

بنایا۔ کہ ان سے بچہ ہونے کی تعویذ لے کر دلہن کے بازو پر باندھ دیا جائے مگر بابوجی کہتے ۔ کہ انہوں نے نہ تو پیر صاحب قبلہ سے تعویذ لی اور نہ بیوی کے بانجھ پن کا علاج کیا ۔ اس کے برعکس اخبار، رسالے خرید خرید کر اشتہاری دواؤں کے آرڈر دینا شروع کر دیئے ۔ پارسلوں پر پارسلیں آنے لگیں محلے والے ہیں ۔ کہ پارسلوں کی قیمت پوچھ پوچھ کر حیران ہوئے جا رہے ہیں ۔ کہ افوہ ۔ یہ بابوجی ہی کا دم ہے ۔ جو اس بانجھ عورت کی محبت میں روپیہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں ۔ مگر وہاں کون جانے بابوجی کی خودغرضی ——— ایک قطرہ دوا بیوی کو چکھنے کے لئے نہ دیتے ۔ خود ہی ساری شیشیاں شربت کی طرح ڈکارتے چلے جاتے ۔

محلے والوں کو بابوجی سے مٹھائی کھانے کی تمنا اور ان کو اشتہاری دواؤں سے کچھ فائدہ ہونے کی اُمید چھینتا ہوا ایک سال اور گزر گیا ۔ لیکن ایک دن وہ حیرت سے اچھل پڑے ۔ شاید دواؤں کے اثر سے ۔ زرد چہرہ تمتما اُٹھا ۔ لاغر جسم بید کی طرح لرزنے لگا ۔

"یہ کیا ہے ؟" ——— وہ کسی پہلوان کی طرح اکڑے ۔ ان کی بیوی سہم کر رہ گئی ۔ اور سینے پر پڑا ہوا دوپٹہ پیٹ پر ڈھلک گیا ۔

"بولو، یہ کیا ہے ؟" ——— انہوں نے پیٹ کی طرف اشارہ کیا ۔ جیسے ابھی گھونسہ رسید کریں گے ۔

" وہی جو تم خوب جانتے ہو ۔" اب اس نے بھی ہمت کر کے جواب دیا ۔ اور بابوجی کا منہ نہ معلوم کیوں لٹک گیا ۔

"اتنے دن تم نے میرا علاج کیا۔ تو کیا میں امید سے نہ ہوتی ؟" وہ بابوجی کو ڈھیلا دیکھ کر اکڑی۔

"خدا تم کو غارت کرے۔" بابوجی نے بے بس عورت کی طرح کوسا۔

"یوں تو مرنا مشکل ہے۔ تم کو ایک ننھے کا ابا بنا دوں۔ پھر دیکھا جائے گا ارے ہاں کہیں لوگ مجھے کچھ کہتے کہتے سچ مچ تمہاری ہی حقیقت کو نہ سمجھ جائیں۔" ——— وہ طنز سے ہنسی۔ بابوجی کا سرخ چہرہ پھر زرد پڑ گیا۔ اور ان کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

"سنو تو ———— انہیں روتا دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھا۔ چار سال کا ساتھ تھا۔ کچھ نہیں۔ تو ایک گھر میں رہنے کی محبت اسے ضرور تھی۔

"ہم دونوں کو مر جانا چاہیئے ——— میں مجبور تھی ——— اور ———"۔ وفور ہمدردی سے اس کا گلا بھر آیا اور وہ پلنگ کی ادوائن پر گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔

چند ماہ بعد ————

نووارد ننھے کی قہقہوں قہقہوں محلہ سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔

"بیٹا مبارک ہو میاں۔ یہ ہماری دعاؤں کا اثر ہے۔" ——— سب سے پہلے محلے کے بزرگوں نے بابوجی کو گھیر لیا۔ اور انہوں نے شرما کر سر جھکا لیا۔

لاشیں

افوہ ! ایک دو ہوں تو کہا جائے ۔ ایک دم گیارہ لاشیں ۔ اونچے اونچے پکے مکانوں میں گھرا ہوا ایک دالان کا چھوٹا سا کچا مکان، جس میں وہ لاشیں رہتیں، لاشیں اور مکان میں رہتیں ؟ لوگ یہ بات سن کر ہنسیں گے ۔ اور کہیں گے کہ لاشیں تو صرف وہ ہوتی ہیں جن کے سرہانے مولوی گلا اینٹھا اینٹھا کر یٰسین پڑھتا ہے ، لوبان جلتا ہے، لوگ روتے ہیں، سسکیاں بھری جاتی ہیں، اور پھر لاش کو زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں گہرا دفن کر دیتے ہیں، یا پھر جلا دیتے ہیں، بہا دیتے ہیں ۔ نہ کہ وہ مکان میں رہتی ہیں ——— میں نے مانا ——— لیکن میں یہ کب کہتی ہوں کہ وہ سب کی نظروں میں کبھی لاشیں تھیں ۔ لاشیں تو وہ صرف میری نظر میں تھیں !

ان گیارہ لاشوں میں ایک بڈھا تھا جو زیادہ تر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہتا

Scanned with CamScanner

یا کسی کسی وقت چلم پیتا اور زور سے کھانستا۔ ایک بڑھیا تھی ۔ زمین پر پھٹا بوریا بچھائے، بڈھے کے قریب ہی پڑی رہتی۔ نہ معلوم کیا ہر وقت بڑبڑایا کرتی، ایک لڑکا تھا۔ کوئی پچیس چھبیس سال کا، بالکل سوکھا سہما اور جیسے دنیا سے بیزار، صبح سویرے اٹھ کر باہر چلا جاتا اور شام کو واپس آتا۔ باقی آٹھ لڑکیاں تھیں جو تلے اوپر کی معلوم ہوتیں اور دیکھنے والا خوب سمجھ سکتا کہ بڈھے بڑھیا نے کبھی اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو قیمتی سمجھا ہوگا —— لڑکیوں کے لباس دیکھ کر مجھے یہ خوف ہوتا کہ اگر ہوا کا ایک تیز جھونکا ان کو لگ گیا۔ تو ان سب کے لباس جسم پر چندھی چندھی ہو کر ہوا میں روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائیں گے —— سب سے بڑی لڑکی اپنے کپڑوں پر پیوند لگاتے لگاتے شاید تھک چکی تھی ۔ کیونکہ اس کے گھٹنے سے لیکر ران تک پاجامے کا کپڑا غائب تھا۔ اور سوکھی سیاہ ران صاف نظر آتی تھی ۔ دوسری تمام لڑکیوں کے کپڑے بھی کچھ ایسے ہی تھے —— کسی کی ابھری ہوئی پسلیاں دکھائی دیتیں، کسی کے بازو، کسی کا پیٹ اور کسی کی پیٹھ، جنہیں ڈھانکنے کی کوشش بھی نہ کی جاتی —— بوڑھے باپ اور جوان بھائی کے سامنے بھی وہ اس طرح گھومتی رہتیں۔ جیسے انہیں اپنی عریانی کا ذرہ برابر بھی احساس نہ ہو —— وہ سب کی سب انتہائی خاموشی سے صبح سے لیکر شام تک بانس کے تین جھلنگا کھٹولوں پر اوندھی سیدھی ایک دوسرے پر پڑی رہتیں۔ اور جب تیسرے پہر کے ڈھلتے ہوئے سورج کی کرنیں چپکے سے دالان میں داخل ہو جاتیں، تب بھی وہ سب پسینے میں تر بتر اپنے اپنے منہ چھپائے پڑی رہتیں ۔

Scanned with CamScanner

صبح کو میں نے کبھی ان کے ہاں چولھا جلتے نہ دیکھا۔ شام کو لڑکا بغل میں چند پوٹلیاں دبائے آتا تو بڑھیا اٹھ کر کھڑا نے لگتی۔ اور لڑکیاں ڈگمگاتی ہوئی اُٹھ کر لڑکے کے ہاتھ سے پوٹلیاں لے لیتیں۔ جنہیں کھولنے پر کوئی دال اور کسی موٹے اناج کا آٹا نکلتا۔۔۔ اس کے بعد کھانا پکنا شروع ہوتا۔ چولھے سے باہر نکلتے ہوئے شعلوں کی روشنی کچی نیچی نیچی دیواروں اور صحن میں ایک پراسرار کپکپاہٹ بن کر ناچتی۔۔۔ جب کھانا تیار ہو جاتا تو سب سے پہلے لڑکے کو دیا جاتا، ایک یا دو روٹیاں۔ اس کے بعد اسی حساب سے بڈھے بڑھیا کھاتے اور پھر سب لڑکیاں۔ وہ اپنے حصے کی ایک ایک روٹی ہاتھ میں لیکر مٹی کے پیالے میں پڑی ہوئی پتلی دال میں نوالے گھنگول گھنگول کر انتہائی خاموشی سے کھاتیں۔ اور چند ہی منٹ میں ان کا کھانا ختم ہو جاتا۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی۔ کہ یہ سب اتنا سا کھا کر کیسے چپ رہتی ہیں۔ کیوں نہیں لڑ مرتیں؟ ایک دوسرے کا کھانا چھین کر کیوں نہیں کھا لیتیں؟ لیکن۔۔۔ وہ تو لاشیں تھیں۔۔۔ بالکل بے جان۔

کھانے کے بعد لڑکیاں دالان میں پڑے ہوئے کھٹولے پکڑ کر صحن میں ڈال دیتیں۔ ایک پر بڑھیا، دوسرے پر بڈھا اور تیسرے پر لڑکا اپنے سر پر بندھا ہوا انگوچھا کھول کر سرہانے رکھتے ہی جیسے پڑتے ہی سو جاتا، اور لڑکیاں بانس کی ڈگر ڈگر کرتی ہوئی سیڑھی سے چڑھ کر دالان کی چھت پر آ جاتیں کیونکہ صحن میں صرف تین کھٹولوں کی جگہ تھی۔ لڑکیاں چھت پر بورے ڈال کر ایک دوسرے سے بھڑ کر پڑ رہتیں۔ یہ تو گرمیوں میں ہوتا لیکن جاڑوں میں

وہ سب کی سب ایک ہی دالان میں کچر پچر گٹھریاں بنی سو رہتیں۔
بس یہ ان کی کل زندگی تھی جسے میں تین سال سے بغیر کسی ردوبدل کے دیکھ رہی تھی۔ انہیں دنیا کی کسی چیز سے کبھی لگاؤ نہ تھا۔ محلے میں قسم قسم کے کھانوں کے پکنے کی خوشبو اڑتی لیکن انہیں اپنی پتلی دال روٹی سے کبھی نفرت کا اظہار کرتے نہ دیکھا۔ وہ ہماری رنگ برنگی ریشمی ساریاں دیکھتیں اور اپنے پھٹے غلیظ کپڑوں پر افسوس نہ کرتیں۔ ہمارے اونچے پکے مکانوں کو دیکھ کر وہ اپنے کچے چھوٹے سے مکان میں گھٹن نہ محسوس کرتیں۔ رات کو اونچے مکانوں میں گراموفون بجتا۔ بھاری گرجدار اور ہلکی سریلی آوازیں قہقہے لگا کر طبلے کے ساتھ سارنگی کے چھڑ جانے کی سی کیفیت طاری کرتیں۔ لیکن میں نے انہیں کبھی ہنستے نہ دیکھا۔ کبھی کوئی گیت گنگناتے نہ سنا۔ اور تو سب خیر۔ جب رات گئے ڈاکٹر بھگت سنگھ کی لڑکی سرلا دودھ جیسی سفید ساری پہن کر اپنی چھت پر چاندنی راتوں میں ٹہلتی اور اس کی ساری ہوا میں ہولے ہولے لہریں لیتی تو ستیش سیٹھ جی کا لڑکا فوراً ہی اپنی بانسری پر کوئی دردناک راگ چھیڑ دیتا' اور سوئی ہوئی لڑکیاں چونک کر اپنی چوڑیاں کھنکانے لگتیں' بوڑھے کھانسنے لگتے اور میں خود بھی سوتے سے جاگ کر اپنی چھت پر جاکر ٹہلنے لگتی ستیش کی بانسری نغمے اگلتے اگلتے جب تھک کر گم صم ہو جاتی تو زمیندار جی کا لڑکا احمد گنگنا اٹھتا۔ اس کا گنگنانا ہی ایسے غضب کا ہوتا کہ زمین' آسمان' چاند' تارے سب جھومتے ہوئے معلوم ہوتے' اس وقت میں جھانک کر نیچی سی چھت پر پڑی ہوئی لڑکیوں کو دیکھتی۔ تو وہ اس وقت بھی منہ لپیٹے بےحس

وحرکت پڑی ہوتیں، احمد کی گنگناہٹ ان میں ذرا بھی تو کسمساہٹ نہ پیدا کرتی ـــــ یہی سب باتیں تھیں۔ کہ میں انہیں لاشیں سمجھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

میں اکثر اپنے چھت والے کمرے کی کھڑکی کھول کر انہیں دیکھا کرتی۔ اور ان سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کھانستی کھنکھارتی تو جھکے ہوئے سروں کو آہستگی سے جنبش ہوتی اور دس جوڑ دھنسی ہوئی آنکھیں کھڑکی کی طرف اُٹھ جاتیں اور پھر پلک جھپکتے ہیں وہ سب سر دوبارہ جھک جاتے۔ بڑی بے اعتنائی سے ـــــ اور میں ان سے باتیں کرنے کا شوق اپنے سینے میں مسوس کر رہ جاتی ـــــ لیکن ایک دن میں نے انہیں کبھی نہ دیکھنے کا تہیہ کر لیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ ہمیشہ کی طرح دوپہر میں کھڑی انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کھانس رہی تھی تو ان سب نے مجھے ایسی خوفناک نظروں سے دیکھا۔ کہ میرا دل کانپ اُٹھا۔ خون تیزی سے رگوں میں گردش کرنے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا اچھلنے لگا۔ اور اس اندھیرے میں مجھے ان کے ہلکے پھلکے اجسام کھڑکی کی طرف اڑتے ہوئے دکھائی دینے لگے ـــــ میں نہ معلوم کس طرح کھڑکی کے پٹ بند کر کے پلنگ پر گر پڑی۔ اور جب ذرا حواس درست ہوئے تو پھر کبھی کھڑکی میں نہ کھڑے ہونے کا تہیہ کر لیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مجھے ان سب سے ڈر لگا۔ ایسا ڈر جس کی وجہ میں خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ اس کے بعد ـــــ میں اکثر چاندنی راتوں میں چھت پر جاتی۔ اور رات گئے تک ٹہلا کرتی، شروع رات اونچے اونچے مکانوں میں گراموفون

بجتا، قہقہے گونجتے اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ اور جب ذرا رات جاتی تو سرلا کی ساری ہوا کے ہلکے پھلکے تھپیڑوں سے لہریں لینے لگتی ستیش اپنی بانسری سنبھالتا، نغمے پھوٹ نکلتے، پھر جب بانسری تھک کر گم سم ہو جاتی۔ تو احمد گنگنا اٹھتا، بڑی ہی گونجتی آواز میں۔ ایسا عجیب سا گیت کہ زمین، آسمان، چاند، اور تارے، سب جھوم اٹھتے، اب ایک کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کئی اونچے مکانوں کے مالک عابد کے لڑکے جاوید کا ۔ چند دن سے ستیش کی بانسری اور احمد کے گنگنانے کے بعد، وہ وائلن پر کوئی محبت بھرا نغمہ چھیڑ دیتا، تو بوڑھے وکیل صاحب کی نوجوان بیوی عذرا اپنی چوڑیوں بھری کلائیاں اپنے پلنگ پر پٹک پٹک جیسے اسکے نغمے کا بے تابانہ جواب دیتی ــــ لیکن کچھ دنوں بعد نہ معلوم کیا ہوا کہ چاندنی راتیں سنسان ہو گئیں ــــ اور میں جو حقیقتوں کی تلخیوں سے گھبرا کر رومان و نغمہ کی وادیوں میں پناہ ڈھونڈھا کرتی تھی، اب مارے کرب کے بلبلایا کرتی، رات کی خاموشیوں میں سنے سنائے نغمے کانوں کو بار بار دھوکا دیتے، وہ ستیش کی بانسری بجی، وہ احمد گنگنایا، وہ جاوید نے وائلن چھیڑا، وہ عذرا کی چوڑیاں کھنکیں، لیکن افسوس ۔ جیسے پُرکیف راتیں لٹ کر رہ گئی تھیں ۔

ایک دن میں اپنے چھت والے کمرے میں پڑی ایک کتاب پڑھ رہی تھی کہ احمد کا گنگنایا ہوا گیت لاشوں کے مکان میں سنائی دیا۔ اور میں کتاب بند کر کے حیرت سے کھڑی ہو گئی، کیا لاشیں گا بھی سکتی ہیں؟ ایک عرصے کے بعد میں پھر کھڑکی کھول کر کھڑی ہو گئی ۔ خدایا! یہ سب تو جیتے جاگتے

انسان ہیں —— انہیں لاشیں کون کہہ سکتا ہے ؟ گھر میں خاص چہل پہل ہو رہی تھی ۔ بڑھیا صاف ستھرے کپڑے پہنے، نئے نئے بنے ہوئے پلنگ پر بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھی ۔ بڈھا چلم کی جگہ حقہ گڑگڑا رہا تھا ۔ اور سب لڑکیاں بھی اچھے کپڑوں اور کنگھی چوٹی سے درست تھیں ۔ ایک احمد کا گیت گاتے ہوئے جھوم جھوم کر گوشت بھون رہی تھی، دوسری لگن بھر گیہوں کا آٹا گوندھ رہی تھی، تیسری آٹھ دس المونیم کے نئے برتن دھو رہی تھی ۔ اور باقی لڑکیاں ادھر سے ادھر کچھ نہ کچھ کرتی پھر رہی تھیں —— میں نے غور سے سب کو دیکھا ۔ چہروں کی سیاہی چھٹ چکی تھی ۔ اور دھنسی ہوئی آنکھیں خوبصورتی سے ابھر آئی تھیں، میں نے خوش ہو کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کھنکھارا ۔

سلام —— سب لڑکیوں اور بڑھیا کے ہاتھ پیشانی کی طرف اٹھ گئے ۔

"اتنے دن سے جو آپ ادھر کھڑی نہ ہوئیں ۔ تو ہم سب یاد کرتے تھے ۔" گوشت بھوننے والی لڑکی نے مسکرا کر کہا ۔ اور للچائی سی نظروں سے میری پھول دار ساری تکنے لگی ۔

"ہوں" ۔ میں مارے خوشی کے کچھ اور نہ کہہ سکی ۔

"اچھی تو رہیں بٹیا" ؟ بڑھیا نے پوچھا ۔

"ہاں" ۔ میں نے جواب دیا ۔

"اچھا خوش رہو، سہاگن بنو" ۔ اس نے سروتہ پلنگ پر رکھ کر کہنا شروع کیا ۔ "ہم اور بڑھو تو بڑے پریشان رہتے ہیں ۔ ان لڑکیوں کی شادی جو کرنا ہے ۔ بڑی لڑکی تیس برس کی ہو گئی ہے، اس سے چھوٹی انتیس سال کی اور اس سے

چھوٹی ———— چھ بچے جاتے رہے ۔ دو پیدا ہوتے ہی مر گئے، دو لڑکیاں جوان ہو کر بڑی بیماری میں مر گئیں ۔ دو لڑکے ہندو مسلمانوں کے جھگڑے میں شہید ہو گئے ۔ وہ تو اچھے گئے اللہ کی راہ میں، مگر رنج تو ان کا ہے، جن کا ہم علاج نہ کر سکے، بیٹا! اس وقت ہمارے پاس کھانے تک کو نصیب نہ تھا پھر علاج کہاں کا —— بس اب تو دعا ہے کہ اتنا ہو جائے، جو ان سب لڑکیوں کو اپنے اپنے گھروں کا کر دیں ——

"ہاں ہاں سب کی ہو جائے گی شادی" ۔ میں نے کہا ۔ اتنے میں لڑکا باہر سے آگیا ۔ صاف ستھرے کپڑے اور پان سے رچے ہوئے ہونٹ، اس نے آتے ہی کھڑکی سے نظریں لڑائیں اور میں نے جلدی سے ہٹ کر کھڑکی بند کر دی ۔

لاحول ولا ۔ خواہ مخواہ غریبوں کو لاشیں سمجھ بیٹھی تھی — میں دل ہی دل میں اپنی اس بیہودہ سمجھ پر پشیمان ہونے لگی —— روٹی ہی تو زندگی ہے —جب یہ بھی نہ ملے تو انسان لاش نہ ہو جائے تو کیا ہو —— اور اب انہیں روٹی ملنے لگی، ضرورتیں بھی پوری ہونے لگیں تو —— سب کے سب کیسے اچھے ہو گئے ۔

میں تمام دن نہ معلوم کیوں ان کی خوشحالی سے خوش رہی —— لیکن شام سے طبیعت پھر اداس ہو گئی —— اللہ —— کیا لاشوں میں جان پڑ سکتی ہے لیکن ستیش کی بانسری نہیں بج سکتی ؟ کیا جاوید کا درد بھرا گیت وائلن پر نہیں چھڑ سکتا ؟ کیا احمد نہیں گنگنا سکتا —— ؟ نہ معلوم کیوں میں بے چین ہو کر

Scanned with CamScanner

رات گئے چھت پر چڑھ گئی۔ ہر طرف ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور چاند کی پھیکی پھیکی روشنی ہر طرف ایک خوفناک منظر پیش کر رہی تھی۔ میں نے ٹہلتے ٹہلتے جھانک کر ایک بار لڑکیوں کو دیکھا اور چونک پڑی۔ وہ سب کی سب سفید چادروں میں لپٹی کھڑی کھسر پسر کر رہی تھیں۔ ایسی اداس خوفناک رات میں ان کا یوں لپٹا کھڑا ہونا مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ اور نہ معلوم کس جذبے کے تحت میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سب چند منٹ کے بعد ایک ایک کر کے سیڑھی سے نیچے اتر گئیں۔ میری نگاہوں نے وہاں بھی ان کا تعاقب کیا۔ بڑھیا اپنے پلنگ پر بیٹھی آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر لڑکیوں کو کچھ اشارہ کیا۔ ایک لڑکی چند منٹ کے لئے اس پر جھک گئی۔ اور پھر وہ سب بلبلوں کی طرح باہر جانے والے دروازے سے پتلی سی گلی میں آگئیں۔ ان کے سائے پکے مکانوں کی دیواروں پر لپٹ لپٹ کر رینگ رہے تھے۔ ایک سایہ تیزی سے بڑھا اور سنبش کے مکان کی بیٹھک کے پاس جا کر غائب ہو گیا۔ دوسرا احمد کے مکان کے احاطے میں بکریاں باندھنے کی کوٹھری میں کھو گیا۔ تیسرا جاوید کے الگ بنے ہوئے سجے سجائے کمرے میں گم ہو گیا۔ باقی سائے چند منٹ تک ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد نہ معلوم کہاں رہ گئے ——

میرے جسم میں نہ معلوم سی کپکپی تھی اور رات کے خوفناک سناٹے میں مجھے اپنے دل کی دھڑکن اس طرح سنائی دے رہی تھی جیسے لوہے کے پہاڑ آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔ میں نے گھبرا کر خوف سے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک سایہ نہ معلوم کدھر سے آکر تیزی سے دوسری طرف جھپٹ رہا تھا۔ بھوت —— میں نے

چیخنا چاہا لیکن آواز حلق ہی میں پھنس کر رہ گئی۔ اور میں نہ معلوم کس طرح اپنے کو سنبھالے زینے طے کرتی اپنے بستر پر آکر گر گئی ـــــــ دھڑکتا ہوا دل بڑی مشکل سے قابو میں آیا۔

بھوک! بھوک۔ برسوں کی سخت بھوک نے ان کی روحوں کو کچل کر انہیں لاشیں بنا دیا اور پھر وہ لاشیں ایک عرصے تک اونچے پکے مکانوں کے درمیان دبی پڑی رہیں۔ لیکن کب تک ـــــــ؟ آخر کار ان کی روحیں زندگی کا لبادہ اوڑھنے کے بجائے بھوت بنکر سروں پر منڈلانے لگیں۔ افوہ! کتنے غضب ناک بھوت ـــــــ انہوں نے ستبش کی بانسری توڑ ڈالی۔ احمد کا گلا گھونٹ دیا۔ جاوید کا وائلن چھین لیا۔ عذرا کی چوڑیاں کرچی کرچی کر ڈالیں اور سرلا کی ساری چندھی چندھی کر ڈالی۔ ہائے ـــــــ خوف و رنج سے میرا دل ڈوبنے لگا ؎

یہ بُڈھے

"ارشد چچا! آج آپ کمرے سے کیوں نہیں نکلتے"؟ عطیہ نے ان کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔

"ہشت! شریر! پڑھنے بھی دے ہفتے میں ایک دن تو فرصت کا ملتا ہے، لا کتاب دے مجھے"!

"نہیں دوں گی"! اس نے ضدی لڑکیوں کی طرح زمین پر پاؤں پٹخے۔ اور کتاب الماری میں رکھ کر زور زور ہنسنے لگی۔

"دے دے عطو"! انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اور پیار سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"دیکھئے جناب ——" وہ کسی مقرر کی طرح اکڑ کر کھڑی ہوگئی ——" شام کا وقت صرف تفریح کے لئے ہوتا ہے نہ کہ موٹی موٹی خشک کتابوں سے سر

Scanned with CamScanner

چھوڑنے کا۔"

"تو پھر کیا کروں دیوانی ---؟" انہوں نے اُسے اپنے پاس بٹھا کر سرخ دھکتے ہوئے گال تھپتھپا کر پوچھا۔

"ہم اور آپ گھومنے چلیں گے!"

"ضرور! بس تو کپڑے تبدیل کر لے پھر چلا جائے۔"

"ابھی لیجئے۔" وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ ارشد چچا کئی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال درست کرنے لگے۔ اور عطیہ تھوڑی ہی دیر بعد زرکار سرمئی ساری میں ملبوس پرس ہلاتی سر پر آدھمکی۔

"اوہ! یہ ٹائی خراب ہو رہی ہے ارشد چچا! اسے ٹھیک کیجئے!" اس نے آتے ہی اعتراض کیا۔

"اوہ!" وہ ذرا بوکھلائے اور جلدی سے دوسری ٹائی باندھ لی۔ عطیہ کے اعتراضات کی بوچھار سے بیچارے گھبرا جایا کرتے۔

"ہماری عطیہ کتنی خوبصورت ہے"! ارشد چچا اس کی طرف بڑھے اور بچوں کی طرح عطیہ کو کھینچ کر اپنے سینے میں دبوچ لیا۔ اور وہ کچھ سہم گئی۔ ارشد چچا کے دل کی تیز دھڑکن اس کے سینے سے ٹکرا رہی تھی، وہ زبردستی ان سے الگ ہو گئی اور سوچنے لگی کہ بھلا اب وہ اتنی بچہ بھی نہیں کہ اُسے یوں سینے سے لگایا جائے۔ لیکن کیا جا نیں۔ ارشد چچا کہ اب وہ بڑی ہو رہی ہے، وہ تو بس اُسے دو سال کی معصوم بچی سمجھتے ہیں --- ارشد چچا اس کے گداز بازو ہولے ہولے دبا کر

کچھ سوچ رہے تھے۔

"اب چلئے بھی ارشد چچا!" وہ اپنے بازوؤں میں ایک عجیب سی کسک محسوس کرنے لگی۔

"چلو!" وہ اس کا گلابی ہاتھ تھام کر باہر نکل گئے۔

پندرہ سولہ سال کی بالکل الھڑ سی عطیہ، ماں باپ کی اکلوتی لاڈلی، اسے دیکھ دیکھ کر جیتے اور عطیہ کے ابا کے دوست ارشد بھی اسے بیحد چاہتے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ عطیہ کو خوش رکھنا اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے تھے۔ دو سال ہوئے جب ان کا تبادلہ لکھنؤ سے دہلی ہوا تھا۔ اس وقت سے وہ عطیہ ہی کے مکان پر مقیم تھے اس اثنار میں انھوں نے کئی بار چاہا کہ الگ مکان لے لیں لیکن عطیہ کے ابا اماں اپنے پرانے دوست کو کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھے، اور عطیہ بھی اس وقت ضدی بچوں کی طرح مچل جاتی جب وہ جانے کا نام لیتے اور ان کو بھی چپ ہو جانا پڑتا۔

وہ کوئی ہونگے پچاس کے لگ بھگ، سرخ سفید رنگ، تندرستی اور زندہ دلی ایسی کہ جوانی بڑھاپے کے آگے سر جھکا دے۔ وہ جب تک گھر میں رہتے عطیہ مارے خوشی کے چہکتی پھرتی اور جب وہ دفتر چلے جاتے تو جیسے گھر میں سناٹا سا چھا جاتا لیکن آج جب وہ باغ میں ٹہل رہی تھی تو بالکل غیر ارادی طور پر وہ بار بار سوچنے لگتی۔ کہ آخر ارشد چچا نے اسے اتنی زور سے اپنے سینے سے کیوں لگایا۔ کہ اب تک اس کی پسلیاں دکھ رہی ہیں۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک کر باغ کے ایک تنہا گوشے میں پڑی ہوئی بنچ پر

Scanned with CamScanner

بیٹھ گئی۔ ارشد چچا بھی پاس ہی بیٹھ گئے اور اس کے سنہرے گھنگریالے بالوں سے سجے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اس وقت وہ بھی نہ معلوم کیوں خلاف عادت بہت سنجیدہ اور مضطرب سے دکھائی دے رہے تھے۔ عطیہ اپنے اوپر ملامت کرنے لگی۔ کہ ارشد چچا کی طرف خیال بد کرنا کتنی بری بات ہے۔

"ارشد چچا آج آپ چپ کیوں ہیں ــــ"؟ اُس نے شرارت سے ان کی انگلیاں مروڑ دیں۔

"کچھ نہیں پگلی"! انہوں نے اس کی انگلیاں اپنی مٹھی میں کھینچ کر چھوڑ دیں اور پھر اسے جھٹکے سے کھینچ کر پیشانی چوم لی۔ عطیہ نے محسوس کیا۔ کہ ان کی سانس پھولی ہوئی ہے اور ہونٹوں سے آگ نکل رہی ہے۔ باغ کا تنہا گوشہ اور ان کی یہ حرکتیں۔ وہ گھبرا کر رہ گئی، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ آج وہ یہ سب کیا کر رہے ہیں۔ آج سے قبل بھی وہ سینکڑوں دفعہ ان کے ساتھ تنہا رہی تھی۔ مگر سوائے سر پر ہاتھ پھیرنے کے انہوں نے کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی، اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا وہ بھی اسے گہری گہری نظروں سے تاک رہے تھے جیسے وہ اپنی آنکھوں میں اس کی نوخیز جوانی جذب کر کے عمر رفتہ کو پرچا رہے ہوں۔

"کیا دیکھ رہی ہے مجھے عطو ــــ"؟ وہ اس کے ریشمی بال سنوارنے لگے۔

"کچھ نہیں ارشد چچا' اب گھر چلیئے"! ــــ وہ کھڑی ہو گئی۔

"بس ہو چکی تفریح۔ ناحق ہی مجھے پڑھنے سے اُٹھا لائی۔ شریر کہیں کی ــــ"

اُنہوں نے اس کے گداز بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا اور وہ کپکپا کر رہ گئی۔

Scanned with CamScanner

"چل اُٹھ پگلی"! وہ زور سے ہنس پڑے۔

"عطو! اگر تو نہ ہوتی تو شاید میں تیرے گھر ایک دن نہ رہتا۔ کیسی پیاری ہے میری عطیہ"! اُنہوں نے بچوں کی طرح اس کی انگلی پکڑلی۔ وہ بالکل خاموش اور بیزار سی نظر آرہی تھی۔ اس لئے چچا بھی کچھ متفکر سے ہو گئے' اور وہ راستے بھر یہی سوچتی رہی۔ کہ اب وہ ایسی بچہ بھی نہیں کہ کچھ سمجھ ہی نہ سکے۔

گھر پہنچ کر وہ بغیر کھانا کھائے اپنے بستر پر چلی گئی اور رات کو بہت دیر تک جاگ کر ارشد چچا کے متعلق سوچا کی' ان کی حرکتیں یاد کرکے اس کے جسم میں کپکپی کے ساتھ دبی دبی نفرت پیدا ہو جاتی' اسی حالت میں وہ یہ فیصلہ کرکے سوگئی کہ صبح سے وہ ان سے بات نہ کرے گی' چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

"بھابی! بچپن کی نیند بھی کیا ہوتی ہے' جب تک ہماری عطیہ کو کوئی جگائے نہ اُٹھ نہیں سکتی"۔

"تم جگا دو ارشد! کب سے ناشتہ لئے بیٹھی ہوں"!

"اب اُٹھ جا عطو"! وہ اس کے پلنگ پر بیٹھ کر اس کا سر سہلانے لگے۔

"دیکھ عطیہ کتنا وقت ہو گیا' اُٹھ جا' میرے دفتر جانے کا وقت آرہا ہے' چائے پی لے"۔ ارشد چچا نے اس کی پیشانی چوم لی' اور وہ بیزاری سے اُٹھ کر مُنہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ میز پر ناشتہ چنا ہوا تھا' وہ تولیہ سے منہ پوچھتی ہوئی میز پر آگئی۔

"عطو اتنا نہ سویا کر' دیکھ پھول جیسا چہرہ مرجھا کر رہ گیا"!

"نیند آتی ہے تو سوتی ہوں"! وہ ذرا بے رُخی سے بولی۔

Scanned with CamScanner

"اور یہ کیک تو کھا عطیہ! بس تو تو چڑیوں کی طرح کھاتی ہے ذرا سا!" وہ اس کی بے رخی کو ٹالتے ہوئے منہ میں کیک دینے لگے اور عطیہ کا دل بالکل صاف ہوگیا۔ اُسے خیال آیا کہ رات کمبخت ارشد چچا کی طرف سے کتنے برے برے خیال آئے لیکن وہ تو اسے بالکل بچہ سمجھتے ہیں۔ اگر وہ بڑی ہوگئی ہے۔ تو بے چارے ارشد چچا کو کیا معلوم ــ؟

"اچھا عطیہ اب میں چلا! شام کو تیار رہنا سینما چلیں گے!" چائے پینے کے بعد وہ جانے کے لئے کھڑے ہوگئے۔

"سچ ارشد چچا کیا ہم لوگ چلیں گے ــ؟" وہ فلم دیکھنے کی بہت شوقین تھی۔

"اور نہیں تو کیا جھوٹ!" وہ چھڑی ہلاتے باہر نکل گئے اور عطیہ اسکول جانے کی تیاری کرنے لگی۔

اسکول سے واپسی پر عطیہ سینما جانے کی تیاریوں میں منہمک ہوگئی۔ کپڑوں کی الماری الٹ پلٹ کر سنہرے کام سے مزین عنابی ساری نکال کر پہنی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر دیر تک پاؤڈر لگایا گیا اور پھر "پرس" ہاتھ میں لٹکا کر اس طرح کھڑی ہوگئی جیسے اب چل دے گی۔ ماں اس کی عجلت دیکھ کر ہنس رہی تھی۔

"اے ہے ابھی تو سینما جانے میں پورا ڈیڑھ گھنٹہ ہے!"

"واہ عین وقت پر کہیں دیر ہوجائے تو ــ؟" وہ بے چینی سے ٹہلنے لگی۔

Scanned with CamScanner

"ابھی تک نہیں آئے ارشد چچا!"

"آجائیں گے ابھی وقت کہاں ہوا ہے!" ماں نے گڑیا جیسی سجی ہوئی عطیہ کو سینے سے لگالیا۔ اتنے میں ارشد چچا بھی چھڑی ہلاتے آگئے

"ارے تم تو بس تیار ہی بیٹھی ہو عطو!"

"اور نہیں تو کیا آپ کی طرح دیر کرتے!"

"کہاں دیر ہوئی ابھی — ؟"

"خیر اب چلئے!"

"بھئی چائے تو پی لینے دے!"

"افوہ! تو پیجئے پھر جلدی"۔ ارشد چچا منہ ہاتھ دھو کر چائے پینے بیٹھ گئے۔ اور عطیہ مارے عجلت کے ایک پیالی پی کر کھڑی ہو گئی۔

"اب پی بھی چکئے ارشد چچا!" سینما جانے کا اضطراب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"کتنا عاجز کرتی ہے یہ تمہیں ارشد!" اماں بیٹی کی بے چینی سے نہال ہو رہی تھیں۔

"اچھا چل!" چچا نے اس کی گوری گوری گردن میں چٹکی لے لی اور ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئے۔

"کیوں عطیہ آج پیدل ہی چلا جائے تو کیسا رہے — ؟"

"ہاں میں سمجھی! آپ بڑے کنجوس ہیں"۔

"ہشت! چل آگے تانگہ کرلیں گے"۔

Scanned with CamScanner

"نہیں بھئی اب تو پیدل ہی چلیں گے کون دور ہے سینما ہاؤس"۔
"پھر نہ کہنا مجھے کنجوس"! ـــــ انہوں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا اور وہ کپکپا کر رہ گئی، پھر وہی حرکت ـــ؟
اس نے غور سے ان کی طرف دیکھا وہ بہت اطمینان سے ہنستے چل رہے تھے۔
ویسے تو ارشد چچا ہمیشہ گیلری کے ٹکٹ لیا کرتے تھے لیکن آج "باکس" کے ٹکٹ لئے۔
"اب تو میں کنجوس نہیں عطو ـــ؟" ـــ وہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے بولے۔
"نہیں بھئی!" ـــ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ ان کا ہاتھ کبھی کبھی بالوں سے پھسلکر گردن پر رینگنے لگتا۔
پردے پر ستارہ کوٹھے مٹکا رہی تھی اور عطیہ شوق سے اسے دیکھنے میں محو تھی، لیکن ارشد چچا بار بار پہلو بدل رہے تھے، وہ سمجھی انہیں کھیل اچھا نہیں لگ رہا ہے۔
"کیسا لگ رہا ہے یہ ناچ آپ کو ـــ؟"
"اچھا ہے ـــ!"
"اور ارشد چچا یہ ستارہ کا دہانہ کتنا عجیب سا ہے، ہے نا کچھ خوبصورت سا ـــ؟"

"ہوگا لیکن ہماری عطیہ سے زیادہ نہیں!" ـــــ انہوں نے اپنی موٹی سی انگلی سے اس کے ہونٹ چھو لئے اور ایک ہاتھ اس کی پشت پر رکھ دیا جو ہلکی سی تھرتھراہٹ کے ساتھ ساری پشت پر رینگنے لگا۔ عطیہ کا جی نہ جانے کیسا ہونے لگا۔ اس نے غصے سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا اور کافی دیر کے لئے سکون ہوگیا۔

ایک سین میں ہیرو ہیروئن کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر پیار کر رہا تھا۔ ارشد چچا کو کچھ برا سا لگا اور انہوں نے بپھر کر عطیہ کو اپنے سینے سے بھینچتے ہوئے جیسے ہیرو کو منہ چڑا دیا۔

"ارشد چچا!" ـــ اس نے گھبرا کر پکارا۔

"کیا ہے عطو!" ـــ ارشد چچا نے اسے چھوڑ کر پیار سے پوچھا حالانکہ بیچارے خود قابو میں نہ تھے، سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور سارا جسم کانپ رہا تھا۔ پھر بھی عطیہ کا اتنا خیال، لیکن عطیہ کو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا اور فلم دیکھنے سے دل اچاٹ وہ سر جھکا کر بیزار ہوگئی۔

"بچی کھیل دیکھ، اسی لئے تو آئی ہے"۔ ـــ انہوں نے اُسے فلم کی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن وہ سر جھکائے رہی۔

"بھئی پیسے خرچ ہوئے ہیں تو اب دیکھ لے عطو" ویسے تو میں لڑکیوں کو فلم دکھانے کا قائل نہیں، اچھی بھلی لڑکیاں خراب ہو جاتی ہیں۔"

"ہو جاتی ہوں گی!" ـــ اس نے منہ پھیر لیا۔

"بس بالکل نادان ہے تو!"

"یہ آپ کا خیال ہے"۔

"شریر بچی!۔۔۔۔ وہ کچھ کھسیا گئے اور باقی کھیل خیریت سے دیکھا گیا۔

"تانگہ کر لوں عطو؟"۔۔۔ انہوں نے باہر نکل کر پوچھا لیکن عطیہ نے کوئی جواب نہ دیا وہ بیحد رنجیدہ ہو رہی تھی' ارشد چچا نے تانگہ کر ہی لیا اور راستہ بالکل خاموشی سے کٹ گیا۔ اور۔۔۔۔۔۔

رات وہ اپنے بستر پر پڑی سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی ارشد چچا اسے بچوں کی طرح چاہتے ہیں۔ ان کی وہ تیز سانسیں' جلتے ہوئے ہونٹ' وہ تھرتھراتے ہوئے ہاتھ' کیا یہ بڈھے بچوں کو اسی طرح چاہتے ہیں۔۔۔ آخر اس کے ابا بھی تو بڈھے ہیں وہ بھی اسے پیار کرتے ہیں لیکن ان کے ہونٹ نہیں جلتے' وہ اپنے دل کی دھڑکن اس کے سینے میں نہیں جذب کرتے اور نہ ہی اسے چھوتے وقت ان کے ہاتھ کانپتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ وہ کس سے کہے۔ کسے جا کر سمجھائے کہ اس کے ارشد چچا پر ایک بہت ہی خوفناک بھوت سوار ہو گیا ہے' اور بھلا کوئی یقین ہی کیوں کرنے لگا۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔

"اٹھ جا' عطیہ' جان!"۔۔۔ صبح ارشد چچا اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہے تھے عطیہ گھبرا کر اٹھ گئی۔ لیکن ارشد چچا کا کندھے پر رکھا ہوا ہاتھ دیکھ کر اسے تاؤ آ گیا۔ اور اس نے زور سے ہاتھ جھٹک دیا۔ ارشد چچا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا اور غصے سے منہ سرخ کئے اس کے کمرے سے نکل گئے۔ عطیہ نے سوچا چلو آج نجات ہو گئی' اب ارشد چچا اس کے ساتھ یہ حرکتیں نہ کر سکیں گے اور پھر آج اتوار تھی۔ ارشد چچا تمام دن میں اس کی ببلیوں کو توڑ کر سفوف بنا ڈالتے'

وہ قدرے مطمئن ہو کر چائے پر جا بیٹھی۔

"ارشد! چلو چائے پیو عطیہ بھی آگئی!"—— ماں نے آواز دی۔

"بھابی میں آج چائے نہ پیوں گا!"

"کیوں نہ پیو گے بھلا—— ؟"—— وہ وجہ معلوم کرنے کے لئے ان کے کمرے کی طرف بھاگیں اور جب واپس آئی ہیں تو غصے سے لال پیلی ہو رہی تھیں۔

"کیوں ری عطیہ! تو نے ارشد کا ہاتھ کیوں جھٹکا۔ نالائق، بدتمیز، وہ کتنا چاہتے ہیں تجھے اور تو نے ذرا بھی خیال نہ کیا—— ؟"

"اماں وہ مجھے بہت پیار کرتے ہیں"——اس نے سمجھا آندھی کا رخ اب پھر جائے گا۔

"ہاں تبھی تو یہ صلہ دیا انہیں، چل معافی مانگ!" اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"آپ سنئے بھی تو اماں جان وہ بات یہ ہے کہ ارشد چچا——"

"خاموش رہ میں کچھ نہیں سننی"——وہ اسے کھینچتی ہوئی کمرے میں لے گئیں۔ عطیہ کا گلا گھٹنے سا لگا، وہ بھی کتنی مجبور تھی۔

"مانگ معافی!"——اماں نے کہا۔

"ہو گا بھابی۔ ابھی یہ نادان ہے۔ میں نے معاف کیا"——ارشد چچا نے عطیہ کے آنسو پوچھ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگے، ماں اس طرح خوشی خوشی باہر چلی گئیں جیسے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہو اور ——————

—————— پھر وہی جلتے ہوئے ہونٹ!

چیلیں

اوہ — کب آئے آپ ہمارے گاؤں میں ؟ اچھا ! تو آپ شہر کے چھل چھدوں سے گھبرا کر گاؤں کی معصومیتوں میں پناہ لینے آئے ہیں ؟ ——
آہ ! یہ ننھا منھا گاؤں ۔ سورج کی جلتی ہوئی کرنوں تلے پسینہ بہا کر کھیتوں کو ہرا کرنے والے کسانوں کی بستی ۔ بھوکے اَن داتاؤں کا دیس — اچھا ! تو آپ کو بہت دکھ ہوا یہ سب دیکھ کر ؟ ہونا بھی چاہئے ۔ سنا ہے کہ اب کچھ شہری لوگوں کو گندم کی بوریوں میں کسانوں کے غلیظ جسموں سے ٹپکے ہوئے پسینے کی بو محسوس ہونے لگی ہے — جی ! آپ اپنی بھوؤں کو ایک دوسرے پر جھپٹنے کی زحمت نہ دیجئے اور آنکھوں میں ناراضگی کی چمک بھی نہ پیدا کیجئے ۔ ہم اور آپ تھوڑی دیر کے لئے ملے ہیں ۔ کیا فائدہ ایسی باتوں سے ۔
سنئے ! آپ نے اب تک یہاں کی کیا کیا چیزیں دیکھی ہیں — ؟ آہ !

پنگھٹ پر سانولی سلونی عورتوں کا ہجوم۔ پھٹے پرانے اوڑھنگے لہنگوں اور کسی ہوئی کرتیوں میں مضبوط جسموں کا اتار چڑھاؤ ——— ہاں بہت ہی دلچسپ منظر ہوتا ہے آپ نے ٹھیک کہا کہ بھلا متمدن شہروں کی چوڑی صاف ستھری سڑکوں پر گھومنے والی عورتوں میں یہ بات کہاں۔ دراصل وہ عورتیں کم سے کم کپڑا پہنتی ہیں عریاں نظر آنے کے شوق میں اور یہاں کی عورتیں مجبوراً کم سے کم کپڑا پہنتی ہیں اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ چھپانے کے لیئے ——— عریانی کس قدر دلکش ہوتی ہے ——— لیکن بیباک عریانی نہیں مجبوب عریانی۔ کیا کہنا ——— اور ——— ہاں! آپ شام شام کو کھیتوں پر سے واپس آتے ہوئے کسانوں کو بھی دیکھ چکے، اور پھونس کے جھونپڑوں سے اٹھتا ہوا نیلگوں دھواں بھی، جسے دیکھ کر تھکے ماندے کسانوں کی میلی آنکھوں میں ایک بہیمانہ چمک رہ رہ کر تڑپ اٹھتی ہے، اف! بالکل ویسی ہی چمک جو نانبائی کی دکان کے سامنے منڈلاتے ہوئے بھوکے کتوں کی آنکھوں میں جنم لیتی ہے۔ خوب ——— بانسری کی تانیں، چرواہے، کجلائی ہوئی آنکھوں میں معصوم اضطراب، سرسوں کے تیل میں ڈوبی ہوئی زلفوں کا بناؤ، چھلکتی ہوئی جوانیاں اور درختوں کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی پیاسی آنکھیں ——— بہت کچھ دیکھ لیا آپ نے ہمارے گاؤں میں، لیکن آیئے میں آپ کو اور بھی کچھ دکھاؤں ——— اُف ——— اوہ! آپ کسمسا کیوں رہے ہیں؟ کیا اس لیئے کہ دوپہر کا وقت ہے۔ اور بھری گرمی کی دوپہر جسم کی کھال تڑخا دینے کو کافی ہے؟ واقعی آپ کو تکلیف تو ہو گی۔ لیکن ذرا دیر کی بات ہے۔ گھوم پھر کر اس گھنے نیم تلے چلے آیئے گا ——— اوہ! آپ راضی ہو گئے۔ شکریہ!

Scanned with CamScanner

میرا ہاتھ پکڑ لیجئے، گاؤں کے سبھی راستے بڑے ناہموار ہوتے ہیں۔ کہیں آپ کے پاؤں میں موچ نہ آجائے —— آپ دھوپ کی تیزی سے کچھ پریشان نظر آرہے ہیں۔ لیکن دیکھئے تو پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، شہر کے رہنے والے تو گاؤں کی کھلی فضا اور صاف ہوا کے بڑے گن گاتے ہیں۔ اور اکثر لوگ تو سجے ہوئے ڈرائنگ روموں میں بجلی کے پنکھوں تلے بیٹھ کر ناولوں ہی ناولوں میں ہم دیہاتیوں کی زندگی پر رشک کرتے ہیں۔ تو یہ کڑاکے کی دھوپ بھی دیہاتیوں کی ان گنت خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی ہے —— ارے آپ تو ہنس پڑے، روئی سی ہنسی —— یقین کیجئے کہ گاؤں کی دوپہریں ہی تفریح کے لئے زیادہ مناسب ہوتی ہیں —— کوئی مجھے آپ کو وہ رونق تو دکھانا نہیں ہے جو بھوکے پیٹ کھیتوں میں سمٹی دنیا کے پیٹ کا دھندا کر رہی ہے —— ارے —— یہ کمبخت چیل بڑی شریر تھی کہ بالکل آپ کے سر پر اپنے پنکھ مار کر نکل گئی۔ کیسا ڈراونا تھا اس کے پروں کا سناٹا —— اب تک گاؤں میں گونج رہا ہے —— ہاں اس وقت بہت چیلیں منڈلا رہی ہیں گاؤں پر —— دیکھئے وہ سامنے گھورے کے قریب بہت سے لوگ جمع ہیں نا۔ —— ہاں دیکھ لیا آپ نے۔ دراصل ہمارے گاؤں میں تین قسم کے جاندار آباد ہیں۔ کسان۔ یعنی ایسے کیڑے جو پاؤں رکھتے ہوئے بھی زمین پر رینگتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پروں کی طاقت دوسروں کے لئے وقف ہے اور یہ بیچارے رینگنے پر مجبور ہیں۔ دوسری قسم ہے بھنگی چمار اور ایسے ہی بہت سے نیچ ذات، یہ ایسے کیڑے ہیں جن کے پاؤں نہیں ہوتے —— جیسے

کینچوے — اور تیسری قسم ہے چیلوں کی — سامنے جو لوگ جمع ہیں وہ ہیں چمار۔ رات لالہ گھنشیام کی بھینس مر گئی تھی، انھوں نے سوچا کہ اگر کمبخت مرنے سے پہلے ہی کہہ دیتی تو کسی قصائی کے ہاتھ بیچ دیتا۔ لیکن اب تو مر ہی گئی ہے گوشت کے دام نہ سہی کھال کے سہی — انھوں نے چماروں کے حوالے کر دیا کہ لو کھال کے دام دے دینا۔ تو یہ لوگ اس بھینس کا گوشت آپس میں تقسیم کر رہے ہیں۔ اور چیلیں اپنا حصہ جھپٹنے کی فکر میں ہیں۔ دیکھئے یہ بھری دوپہر میں اپنی کھاجی جھپٹنے کی فکر میں کتنی خوفناک معلوم ہو رہی ہیں۔ ننھی ننھی آنکھیں۔ مڑے ہوئے خاردار پنجے اور تیز چونچیں — کیسے پیارے آہستہ آہستہ چکر کاٹتی ہوئی نیچی ہوتی جا رہی ہیں — اور سنئیے! اب تو کچھ بولتی بھی جا رہی ہیں۔ اپنے حساب کچھ میٹھی میٹھی باتیں — وہ دیکھئے ایک ناسمجھ لڑکا اپنے حصے کا گوشت چھپانا بھول کر اوپر دیکھ رہا ہے۔ شاید اس کے کانوں کو چیلوں کا چیپانا بھلا لگ رہا ہوگا — اوہ! وہ بیک وقت کئی چیلوں نے جھپٹا مارا اور لڑکے کے ہاتھ سے گوشت لے اڑیں۔ چچ چچ! بیچارے لڑکے کے ہاتھ میں چیلوں کے خاردار پنجے لگنے سے خون نکلنے لگا۔ پر چیلوں کو اس سے کیا مطلب انہیں تو گوشت چاہئیے تھا، گوشت — اور وہ لے گئیں، کتنی ہوشیار ہوتی ہیں یہ۔ ناسمجھ پر تو بڑی پھرتی سے جھپٹا مارتی ہیں۔ لیکن ان سمجھدار چماروں کو دیکھئے۔ انھوں نے اپنی لاٹھیاں بلند کر رکھی ہیں — تاکہ چیلیں جھپٹا نہ مار سکیں — اور اگر ماریں بھی۔ تو صاف بچ نہ نکلیں۔ آپ جانئیے — لاٹھی بڑی بکٹ چیز ہوتی ہے۔ اس سے تو بھوت بھی بھاگتے ہیں —

ٹھہریئے! ابھی سے کہاں چلیں؟ اب یہ بھی تو دیکھ لیجیئے کہ گوشت ختم ہو جانے کے بعد چیلیں کس طرح گم ہو جاتی ہیں آسمان پر سے ——
دیکھا سب لوگ گئے۔ گوشت ختم ہو گیا چیلیں بھی مال غنیمت چٹ کر کے اپنے پروں کو سمیٹ درختوں پر اونگھنے لگیں۔ آیئے اب چلیں ——
ہاں ٹھیک کہا آپ نے کہ اتنی دیر یہاں یہ گندہ سا تماشا دیکھنے سے کیا حاصل ہوا۔ لیکن میرا مطلب تھا کہ آپ کو یہ چیلیں دکھا کر ان کی ایک ایک حرکت آپ کے ذہن نشین کرا دوں۔ شاید آپ بھولے تو نہ ہونگے کہ میں نے تھوڑی دیر قبل اپنے گاؤں میں بسنے والے تین قسم کے جاندار بتائے تھے۔ کسان۔ نیچ اور چیلیں۔ تو اب میں آپ کو چیلیں دکھاؤنگی۔ بالکل ان ہواؤں میں پرواز کرنے والی چیلوں کی طرح خوفناک چیلیں ——
اوہ۔ آپ اب کچھ تھک گئے ہیں۔ خوب! یہ اچھی کہی آپ نے کہ میں نے کیسے پہچانا؟ ارے بابا آپ کے پاؤں جو لڑکھڑا رہے ہیں۔ اچھا آیئے اب اس گھنے پیپل تلے بیٹھ جایئے۔ لیکن دیکھیئے ذرا تنے سے الگ ہٹ کر بیٹھیئے گا۔ یہ جو سیندور لگے چند پتھر پڑے ہیں نا — ان کا کچھ لحاظ کیجیئے۔ ورنہ کسی سر پھرے خدا کے ماننے والے نے دیکھ لیا تو فضول کل کل کرے گا —— بات یہ ہے کہ یہ پتھر کے دیوتاؤں کی ہی سختی ہے جو یہاں کا نظام ایک ہی ڈھرّے پر چلے جا رہا ہے۔ اور آپ جانیے۔ کہ دیہاتی اپنے حاکموں کے کس قدر وفادار ہوتے ہیں ——
ہاں! یہ رونے کی آواز؟ جب سے یہاں بیٹھی ہوں میں بھی برابر

سُن رہی ہوں، سامنے والی جھونپڑی سے آرہی ہے ـــــ سندریا چمارن ہے بیچاری ۔چھ سات دن ہوئے کہ اس کا باپ مر گیا ہے ۔شاید اسی لئے رو رہی ہے ـــــ ہاں ٹھیک ہے، ماں باپ تو سبھی کے مرجاتے ہیں، لیکن شاید یہ سندریا اس لئے بہت مچل مچل کر رو رہی ہے کہ اس کا باپ اس کے حصے کی روٹی بھی اپنے ساتھ لے گیا ـــــ وہ چھوٹا سا لڑکا ؟ وہی جو جھونپڑی کے دروازے پر بیٹھا گوشت کے بڑے سے لوتھڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر رہا ہے ؟ وہ سندریا کا بھائی ہے ـــــ اس وقت آپ نے جو مری ہوئی بھینس دیکھی تھی نا ؟ وہیں سے اسے بھی گوشت ملا ہوگا ۔کیسی خوشی سے کاٹ رہا ہے ۔ بیچاری بہن کھٹولی پر پڑی، امنڈ امنڈ کر رو رہی ہے اور اسے ذرا بھی فکر نہیں ـــــ ابھی بہت ناسمجھ ہے اس لئے کسی کے رونے دھونے کا اثر نہیں لیتا ـــــ اوہو! تو آپ سندریا کو قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں ـــــ ؟ لیکن دیکھئے ہم یوں اس کے قریب جائیں گے تو ڈر جائے گی ـــــ گنوار ہے نا ؟ صاف ستھرے کپڑے دیکھ کر یہ لوگ اس طرح چوندھیا جاتے ہیں کہ جان کا بھی ہوش نہیں رہتا ـــــ

سچ بڑی تیز نظر بن ہیں آپ کی ـــــ ! سندریا کو چھپ کر دیکھنے کی جگہ تو اچھی تلاش کرلی ـــــ نہیں اب اس کھنڈر میں کوئی نہیں رہتا ـــــ آیئے پھر وہیں چلیں ـــــ

اور ر ـــــ جسم کا بوجھ مت ڈالئے دیوار پر ۔ کہیں ڈھے گئی تو اور مصیبت ہوگی ـــــ دیکھا ؟ پسند نہیں آئی ! کیا اس لئے کہ یہ بہت کالی

Scanned with CamScanner

کلوٹی ہے ؟ خیر آپ کو اس کا کسا ہوا جسم ہی پسند آگیا یہی بہت ہے ــــــ عجیب سوال کیا آپ نے کہ کیا یہ بہت نادار ہے ! یہی کیا یہاں سب ایک ہی حال میں ہیں ــــــ ناداری کی انتہا یہ ہے کہ احساس ناداری بھی مٹ گیا ــــــ

ارے آپ اس آخ تھو سے چونک کیوں پڑے ؟ یہی تو لالہ گھنشیام جی ہیں ۔ ان کے پاس بہت دولت ہے ۔ جو سود پر چلتی ہے ۔ وہ سرخ رنگ کا پکا مکان انہوں نے تھوڑے ہی دن ہوئے کہ اپنی دولت کو نیند رکھنے کے لئے بنوایا ہے ــــــ دیکھئے اب وہ اپنی بیٹھک سے سر نکالے اسی طرف دیکھ رہے ہیں ــــ اس لئے چپ کٹلی ۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ ہم لوگ یہاں چھپے بیٹھے ہیں تو جانے کیا سمجھ کر ہم دونوں کو پنجایت میں گھسیٹ بلائیں گے ۔ اور پھر ــــــ

"خوں آخ تھو !" لالہ جی نے زور سے گلا صاف کر کے بلغم تھوکا اور ململ کی سفید دھوتی گھٹنوں سے سمیٹ کر بائیں ہاتھ سے رانوں کے بیچ میں دبا لی ۔ اور پھر بیٹھک سے نکلکر چبوترے پر کھڑے ہو کر بھولا بھالا چہرہ گھما گھما کر اپنی آنکھیں گھمانے لگے ــــ اور جب دوپہر کو بہت ویران دیکھا تو سندریا کی طرح کم نہ ہونے والی ریں ریں نے ان کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے ــــ وہ مارے مٹاپے کے ہانپتے کانپتے اپنے چبوترے سے اترے اور موٹے دومنہے سانپ کی طرح رینگتے سندریا کی جھونپڑی کے دروازے تک پہنچ گئے ۔

"اری سندریا کاہے کو روئے جاتی ہے؟ ماں باپ سدا کس کے رہے۔ اب چپی ہو جا ری —" انہوں نے بلغم آلود آواز میں کہا اور پھر آگے بڑھ کر ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔

"رام رام!! یہ مرا ہوا ماس —" لالہ جی لڑکے اور گوشت دونوں سے بچنے کے لئے اپنی دھوتی کو اچھی طرح سمیٹ کر جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ — سندریا کی ریں ریں ہمدردی کے بول سنکر ایک دم تیز ہو گئی تھی لیکن جب لالہ جی کی کھڑاؤں جھونپڑی کے اندر بجی تو وہ کھٹولی سے اٹھ کر اپنی اوڑھنی سنبھالتی ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس کے بیڈھب پھولے ہوئے گلوں پر آنسو رک رک کر لڑھک رہے تھے اور موٹے موٹے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کا سر اس طرح جھکا ہوا تھا جیسے بھاری بھرکم لالہ کے ہمدردی کے دو بول اس سے اٹھائے نہ اٹھ رہے ہوں۔

"اب تو تیرا کام یہ ہے کہ بالے بھائی کو سنبھال۔ نہ کوئی تیرے آگے نہ پیچھے۔ رونا دھونا چھوڑ —" لالہ جی کی سمٹی ہوئی دھوتی ہاتھ سے چھٹ گئی۔ اور انہوں نے آگے بڑھ کر سندریا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر نہ جانے کیوں جھجھک کر ایک دم ہٹا لیا —

دیکھا آپ نے؟ یہ لالہ جی بڑے پاکباز ہیں۔ اچھوت کو چھوتے ہی جھجھک جاتے ہیں اور مرا ہوا گوشت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے — ہاں یہ دوسری بات ہے کہ مردار گوشت کھانے والوں کو بخوشی ہڑپ کر جائیں — یہ گانے کی آواز؟ للّو سنار گا رہا ہے — وہ دیکھئے وہ کبھی اپنے مکان

سے نکل کر ادھر ہی آ رہا ہے — یہ بھی بڑا سمجھدار آدمی ہے ۔ اس کے ہاں جو زیور بننے آتے ہیں ان میں کھوٹ کر کر کے اس نے اپنا اتنا اونچا مکان کھڑا کر لیا اور آج مزے سے لالہ جی کے مقابلے میں سودی روپیہ چلاتا ہے۔ خوش مزاج بھی ہے ۔ اور گاؤں میں ہر دلعزیز بھی ۔ خصوصاً کسانوں میں کیونکہ یہ لالہ جی کی طرح ہر سٹّے اپنے قرضداروں کو عدالت جھنکوانے کی دھمکی نہیں دیتا اور نہ اُٹھتے بیٹھتے اصل رقم کا مطالبہ ہی کرتا ہے۔ بلکہ اسے تو فصل کٹنے پر اپنا ڈبل سود بچکارا دے کر وصول کرنے کے بعد قرضدار کو اصل رقم کی طرف سے بے فکر رہنے کی تلقین کرنا پسند ہے ——— نہ سمجھنے کی بھی ایک ہی کہی آپ نے — سب قرض دار یہ چال اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ جب خودکشی کرنے والے کو میٹھا زہر ملے تو کڑوا زہر کیوں پیئے —! اے وہ دیکھئے للّو اب بالکل قریب آگیا ۔ اس لئے ہم کو بالکل چپ ہو جانا چاہیئے ۔

"سندر ناری پریتم پیاری"۔ للّو لہک لہک کر گاتا ہوا سندریا کی جھونپڑی کی طرف بڑھا لیکن لالہ جی کو وہاں دیکھ کر جھجھک گیا ۔ اور لالہ جی جواب تک اپنی دھوتی چھوڑے اطمینان سے کھڑے سندریا کو تاک رہے تھے پھر اپنی دھوتی سمیٹ جانگھوں تک ننگے ہو گئے اور مولوی صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے لڑکے کی طرح جلدی جلدی رٹنے لگے ———

" اری اب روئے دھوئے سے بات نہ بنے گی ۔ ارے للّو بھیا جرا اس مورکھ کو تمہی سمجھاؤ ۔"

"ارے لالہ جی یہ چھوکری بڑی نادان ہے۔ تم ناحک اپنا سکھ چین چھوڑ یہاں ٹھاڑے ہو ——" للّو نے لالہ جی کو آنکھ ماری۔ اور خود بھی ذرا سمٹا سمٹا یا جھونپڑی کی چوکھٹ پر کھڑا ہو گیا۔ سندریا کا بھائی گوشت کے لوتھڑے کی بوٹیاں بنانے میں منہمک تھا۔ اور آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں۔

"ارے بھیا اپنے گاؤں کی لونڈیا ہے اسے دکھ میں دیکھ کر اپنا من بھی دکھی ہوتا ہے" لالہ جی نے ایک ٹھنڈی سانس اس زور سے لی کہ ان کا توند بھُد کا تو... سندریا بھی کانپ گئی۔ اور للّو کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ مچل گئی۔

"ہاں —— ! اپنے گاؤں کی لونڈیا ہے تبھی کھیال ہوتا ہے۔ پر اب ہووے کا ؟ سا جی مانو لالہ اس کی ہائے ہائے سے نیند نہیں پڑتی"۔

سنا آپ نے ؟ للّو بھی کچھ کم رحم دل نہیں۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ میری آنکھوں دیکھتے دیکھتے ایک بڑھیا للّو کے گھر کے پاس بھوکی پیاسی دہائیاں دے دے کر مر گئی پر للّو کی نیند دم بھر کو نہ اچٹی —— ارے اب اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ للّو بے رحم ہے، بات اصل یہ تھی کہ اول تو وہ بڑھیا دوسرے کسی اور گاؤں سے آ کر یہاں پڑ گئی تھی اور سندریا۔ ؟ سندریا تو اپنے ہی گاؤں کی چھوکری ہے یہیں پیدا ہوئی، بڑھی اور جوان ہوئی پھر ہمدردی کیسے نہ ہو ؟ اچھا اچھا ! اب میں چپ ہوں آپ ادھر دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں اور میں خواہ مخواہ مخل ہوتی ہوں ——

"لونڈیا نے سات دن میں روئے روئے تارہ جیسی آنکھیں کھراب کر ڈالیں —— پگلیا نہیں تو —" للّو نے اب کے اس زور سے لالہ جی کو آنکھ ماری

کہ لالہ جی کے گالوں پر خون جھلک گیا۔ اور اُنھوں نے اپنی دھوتی سمیٹ کر سندریا کی بانہہ پکڑ لی اور سندریا جو روتے روتے تھک چکی تھی پھر رو پڑی۔ مارے احسان مندی کے سر جھک گیا۔ للّو کی ہمدردی نے بھی زور مارا تو اُس نے بھی بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا جو چند ہی لمحے بعد نیچے کی طرف ڈھلک گیا اور سندریا کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اپنی اتنی عزت افزائی پر حیرت سے کچھ پھیل گئیں ـــــ جھونپڑی سے باہر سندریا کا بھائی۔ ننھی سی جان گوشت کے بڑے سے لوتھڑے سے چمٹا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بہن کی ریں ریں میں دو وقت کی بھوک کو زیادہ دخل ہے۔ اس لئے وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے جلدی جلدی گوشت کی بوٹیاں کر رہا تھا ـــ اور ہوا میں کئی چیلیں ایک ساتھ منڈلا کر ایک ساتھ چہچہا رہی تھیں ـــــ سندریا اپنے آپ کو چھڑا کر چولھے کے پاس گر سی پڑی اور چولھے کی ٹھنڈی راکھ کو مٹھیوں میں لے لے کر گرانے لگی۔ لالہ جی اور للّو نے ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ اگر دو چار پیسے دے کر بھاری سود وصول ہوتا رہے تو کیا بُرا ہے؟ لالہ جی کچھ غیر مطمئن سے نظر آ رہے تھے ـــ لیکن للّو سود وصول کرنے میں اپنا جواب آپ تھا اس نے اپنی انٹی ٹٹولنا شروع کر دی۔"

شہروں کی بات نہ چلایئے۔ وہاں عصمت کے بدلے روٹی ملتی ہو۔ تو ملتی ہو۔ یہاں تو صرف دو ور دو ور فٹ فٹ ملتی ہے۔ اگر آپ یہاں سال دو سال بعد پھر آئیں گے۔ تو اسی سندریا کو تمام دن دو ایک پیسے پر کسی کھیت میں یا کسی گھر میں مزدوری کرتے دیکھیں گے ـــ اور ایسی ہی ننھی ننھی ہوئی دو بھرول

اور خاموش راتوں میں للّو اور لالہ جی جیسے نہ معلوم کتنوں کو اس کی جھونپڑی کے گرد گھومتے دیکھیں گے ——— اوہ! آپ چونک کیوں پڑے؟ اچھا جوتوں کی چرمر کچھ عجیب لگ رہی ہے آپ کو؟ وہ جو سر پر سرخ چارخانے دار انگوچھا ڈالے آرہے ہیں وہ مولوی جی ہیں اس گاؤں کے —— دیکھئے ہنسئے مت ان بے چارے کی غیر معمولی لمبی داڑھی پر —— ورنہ کہیں انہیں معلوم ہو گیا کہ آپ ہنس رہے ہیں تو فوراً اللہ میاں کے ہاں آپ کے لئے ایک اسپیشل دوزخ تعمیر ہونے کا مژدہ سنا دیں گے —— اے وہ ادھر ہی سے گزریں گے شاید۔ خاموش!

مولوی جی پراسرار نگاہوں سے دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھتے ہوئے سندریا کی جھونپڑی کے پاس سے نکلنے لگے۔ ترچھی نظر سے دیکھا کہ لالہ جی اور للّو موجود ہیں۔ تو بے نیازی سے آگے بڑھنے لگے۔ للّو نے دیکھ لیا خود تو کیچڑ میں پڑا ہی تھا۔ دوسروں کے صاف کپڑے کیسے دیکھتا؟ خواہ صاف کپڑوں کے نیچے کیچڑ چھپی کیوں نہ پڑی ہو —— اچھال کیچڑ ——

"بندگی مولبی جی۔ یہاں اتنے وکھت"؟ وہ اپنی منڈیا ہلا کر بولا۔ اور لالہ جی کی توند بھی پھدکی۔

"ذرا کام سے جا رہا ہوں"۔ مولوی جی نے بے اعتنائی سے چل دینے کے لئے قدم بڑھایا۔

"میں نے کہا آؤ تنک سندریا کو سمجھائے دو نا۔ رو دئے روئے گھبرائے دیتی ہے"۔ للّو نے پھر مولوی جی کی فطرت پر پڑی ہوئی زہد کی چادر کھینچ کر

انہیں ننگا کردینا چاہا۔ لیکن مولوی جی کی گوشت خور فطرت کا نردوں کی دال خور کوشش سے ننگی نہ ہوسکی۔

"بڑا ضروری کام ہے۔" اور مولوی جی لمبا چکر کاٹ کر مسجد میں پہنچنے کے لئے روانہ ہوگئے۔

میں کہتی ہوں کہ آخر آپ یہ کیوں سمجھ بیٹھے کہ مولوی جی کو سندر یا کی یتیمی کا کوئی ملال نہیں۔ بھلا آپ کو کیا معلوم کہ بیچارے نے سندر یا کے آنسو اس وقت پونچھے جب للو اور لالہ جی کو سندر یا کا ذرا بھی خیال نہ آیا تھا۔ اور میرا تو خیال ہے کہ اس وقت ان کا یوں بے اعتنائی سے چلے جانے کا باعث بھی یہی ہے کہ ان سے زیادہ ہمدردی کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے۔ جو یہاں ڈیرا ڈالے؟ بات یہ ہے کہ مولوی صاحب ہر معاملے میں آپا دھاپی کے عادی ہیں۔

"سندر یا دیکھ جو دو چار پیسے کی جرورت ہو تو مانگ لیجو مجھ سے پر دیکھ میری عورت کے سامنے متی مانگیو، تو جانتی ہے وہ بڑی ——— ہے۔" للو نے اپنی انٹی سے کچھ پیسے نکال کر سندر یا کی گود میں ڈال دیئے۔

"ہاں! ہاں شرم مت کیجیو۔" لالہ جی نے بھی گردن ہلائی اور سندر یا کے چہرے پر خون کی سرخی گہری ہوگئی۔

"دیکھ! روئیو دھوئیو متی۔" للو نے کہا اور پھر دونوں ساتھ ہی ساتھ دھوتیاں سمیٹتے جھونپڑی سے نکل گئے۔

جی! ابھی بس کہاں ——— وہ دیکھئے نا سامنے سے پٹواری جی بھی

Scanned with CamScanner

آرہے ہیں اور ان کے ساتھ جو ہٹا کٹا آدمی ہے نا! وہ زمیندار کا کارندہ ہے ——
منہ اندھیرے پنڈت جی بھی لٹیا لے کر کسی سنسان جگہ کی تلاش میں اب اسی
راستے سے گزرنے لگے ہیں —— وہ بھی تو —— اور پھر کوئی گنتی نہیں گاؤں
کے بھکے ہوئے چھوکروں کی۔ اچھا آیئے چلیں —— آپ تھک گئے ہونگے
کتنی دیر تو ہو گئی یہاں کا تماشہ دیکھتے دیکھتے —— چلیئے اس طرف سے نکل
جائیں۔ ورنہ زمیں دار کا کارندہ بڑا بے ڈھب ہے۔ یہاں سے نکلتے دیکھ
لے گا۔ تو خواہ مخواہ —— اوہ —— خوب یاد دلایا آپ نے کہ میں آپ کو
اپنے گاؤں میں بسنے والی چیلیں دکھانے لائی تھی وہ اب تک نہ دکھائیں۔
تو میرے دوست سندریا کی جھونپڑی کے پاس آپ چیلیں نہیں تو کیا کچھ اور
دیکھ رہے تھے ——؟ "یہ نیچ" —— مردار گوشت —— انہیں ہمارے گاؤں
میں بسنے والی "اونچ" چیلیں بڑے شوق سے تلاش کر کر کے کھاتی ہیں ——
اور آپ انہیں پہچان بھی نہ سکے —— اچھا خدا حافظ —— وہ رہی آپ کی
راہ —— ٭

۱۳-۹
۱۹۳

Scanned with CamScanner

کیا پایا؟

"کسی خاموش مقام پر ایک خاموش کوٹھی۔ خوبصورت پائیں باغ، اور ایک
ایسا باورچی جو گوشت خوب پکاتا ہو، ٹوسٹ بہترین سینکتا ہو اور میں ٹھاٹ سے
کھاتی ہوں۔ تو پھر کسی چیز کی پرواہ نہ رہے۔ آہا کیسی مزے دار زندگی ہو لیکن بھی
ان تمام چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ چند سہیلیاں ہوں، گوری گوری لمبی
آنکھوں والی جو شام کو میرے ساتھ باغ میں ٹہلا کریں۔ اف ـــــ دنیا
رشک کرے میری زندگی پر ـــ" میں نے اکثر انہیں کہتے سنا تھا۔ بیچاری کی
دنیا بھی کس قدر محدود تھی۔ لیکن لگتی کچھ پیاری۔ میرے دل میں بھی امنگ
اُٹھنے لگتی۔ کہ کاش مجھے بھی یہی سب کچھ مل جائے۔ شادی کے بکھیڑوں
میں وہ پڑنا نہ چاہتی تھیں بلکہ ایک طرح سے انہیں شادی سے نفرت تھی۔
"بس ایک مرد کے ہو کر رہ جاؤ۔ دنیا کا ہوش نہ رہے، بس ہر طرف تاریکی۔

Scanned with CamScanner

چھی چھی ! انہیں تو پسینے چھٹنے لگتے۔ ذرا قمیص میں رفو کر دینا اور وہ دو پائجاموں کا کپڑا رکھا ہے ذرا انہیں سی ڈالو۔ تم کو تو بس فرصت ہی نہیں ملتی نہ معلوم دن میں کیا کیا کرتی ہو ——؟ اور ہاں دیکھو وہ آج میں دفتر سے جلدی آؤں گا وہ میرے چاکلیٹی سوٹ پر استری کروا رکھنا۔ ایک دوست کے ہاں چائے پر مدعو ہوں۔ اور یہ تم منہ کیوں بسورنے لگیں ——؟ میں نے کہیں آنے جانے کا نام لیا اور تمہارے چینگیاں لگیں ——" تو وہ بیچاری شادی کے بعد کچھ اس قسم کی باتوں سے بہت گھبراتی تھیں اور مثلاً ان باتوں کو نہ جانے کتنی بار میرے سامنے دہرایا تھا۔ کچھ یہ بات بھی تھی کہ ان کی شادی شدہ سہیلیوں نے اپنے ذرہ ذرہ سے گھریلو جھگڑے نہیں بتا کر شادی سے اور بھی خائف کر دیا تھا۔ لیکن میری تو خاک سمجھ میں نہ آتا۔ کہ ان باتوں میں آخر کونسا لبس بو یا ہوا ہے ——؟ میری اماں ابا کے بھی سب کام بہت ہنسی خوشی کیا کرتیں۔ کبھی کبھی لڑائی بھی ہو جاتی۔ اماں گھر میں بڑی رویا کرتیں اور ابا باہر غائب رہا کرتے، پھر میل ہو جاتا مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ لڑائی کی باتیں کسی دوسرے تک پہنچی ہوں، چپکے چپکے سب ہی کچھ ہو جاتا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے اماں ابا کی زندگی خاصی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ وہ ناحق ہی شادی کے نام سے چڑھا کرتیں۔ اور جب کوئی شادی کے لئے زیادہ مجبور کرتا تو بے اعتنائی سے کہہ دیا کرتیں کہ دیکھا جائے گا کر لیں گے کبھی۔ خیر وہ کیسی ہی ہوں مجھے ان سے بڑی محبت تھی۔ گوری گوری جب اپنی لمبی لمبی آنکھیں پھیر پھیر کر باتیں کرتیں تو مجھے بے ساختہ پیار آنے لگتا۔ طبیعت نہ جانے کیوں حسن پرست پائی ہے۔ لیکن انہیں اپنی حسن پرستی کی کوئی مثال نہ دے

سکی بھی اپنی بزرگ تھیں مجھے ڈر لگتا۔ حالانکہ وہ ادب وغیرہ کی قائل نہ تھیں۔ زندگی کو ہر طرح سے آزاد دیکھنا چاہتی تھیں اس لئے وہ مجھ سے بہت بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتیں اور باتیں ہی کیا ہوتیں۔ وہی شادی کے خلاف خوب خوب کان بھرنا۔ مگر میں ایسی کوڑھ کہ ان کی باتوں پر دھیان ہی نہ دوں۔ وہ اکثر جل کر کہا کرتیں کہ اپنا کیا جاتا ہے، کمبخت تو ہی ساری عمر میاں کی جوتیاں سیدھی کرتی رہے گی۔ اپنا تو ایم۔ اے کا ایک سال اور رہ گیا ہے۔ پھر ٹھاٹ سے ملازمت کریں گے۔ کوٹھی۔ باغ۔ باورچی۔ گوشت اور ٹوسٹ۔ آہا —— وہ چٹخارے لینے لگتیں اور ایمان کی بات ہے کہ بیچاری پڑھ بھی بڑی مصیبت سے رہی تھیں۔ ٹیوشن کرتیں جس سے تمام اخراجات پورے ہوتے پھر بھلا آئندہ کے تصورات سے چٹخارے کیوں نہ لیتیں اور پھر تعلیم حاصل کرنا کوئی آسان کام تو ہے نہیں۔ وہ بھی ڈگریاں حاصل کرنا۔ برسوں دق کے مریض کی طرح جھیلنا پڑتا ہے۔ دماغ پکے ہوئے تربوز کی طرح پلپلا ہو جاتا ہے۔ دُنیا کا ہوش نہیں رہتا۔ بس پڑھے جاؤ پڑھے جاؤ ——

میرا اور ان کا مکان بالکل قریب قریب تھا۔ وہ امتحان کی تیاریوں میں مشغول تھیں۔ اس لئے ان کے پاس جاتے ہوئے ڈر لگتا۔ بھوکا کتا ذرا ٹھیس لگنے سے بھنبھوڑ کھاتا ہے۔ اور امتحان کے زمانے میں تو ان کی وہ پیاری پیاری صورت بالکل خبیث ہو کر رہ گئی تھی۔ اماں غریب بیٹی کی جھڑکیاں بات بات پر سنتی اور معصوم بہن ذرا زور سے بولی اور تھپڑ کھایا۔ پھر بھلا میری ہمت کیونکر ہوتی۔

Scanned with CamScanner

کہ ان کے پاس جا کر بیٹھوں بس دُور ہی سے ان کی خوبصورت آنکھوں کو دیکھا کرتی اور نہ وہ ہی توجہ دیتیں کہ کون کمبخت آیا ہوا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا کہ زیادہ پڑھنے سے ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں میں نے اکثر سوچا کہ اگر ان کی آنکھیں خراب ہو گئیں تو یہ دو کوڑی کی نہ رہیں گی۔ اور میں تو سچ مچ پھر ان کی صورت نہ دیکھوں گی اور نہ خدا مجھے ایسے کریہہ منظر دیکھنے کی توفیق دے۔

خدا خدا کر کے ان کا امتحان ختم ہوُا اور انھوں نے ایک اطمینان کی سانس لی پھر بھی کسی کسی وقت بے کل ہو جایا کرتیں۔ شاید امتحان کے نتیجے کی فکر ہو رہی تھی۔ آخر ایک دن نتیجہ بھی نکل آیا۔ فرسٹ ڈویژن آئی تھیں۔ مارے خوشی کے ان کا برا حال ہو گیا اور اسی خوشی میں مجھے ڈھیر سی مٹھائی کھلا ڈالی اور ان کی اماں جو زیادہ خوش ہوئیں تو فرما دیا کہ اب تو تو شادی کر لے ورنہ پھر کب ہو گی پینتیس سال کی عمر ہو گئی۔ اس پڑھائی پر اللہ کی مار۔ پڑھتے پڑھتے بڑھاپا آجاتا ہے۔ بس وہ یہ سُن کر بپھر اُٹھیں — "ہم سے نہ ہوں گے کسی مرد کے دلار۔ آپ کی تو عمر گئی ابا کے لاڈ کرتے کرتے، اسی لئے مجھے بھی یہ صلاح دی جا رہی ہے۔ کیا ہم نے اسی دن کے لئے پڑھا ہے کہ عیش سے بھی بسر نہ کریں —؟"

اماں غریب یہ صاف جواب سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ ادھر انھوں نے ملازمت کی درخواستیں دینا شروع کر دیں اور مجھے رنج ہونے لگا۔ اب بھلا ان کی یہ لمبی لمبی آنکھیں کہاں دیکھنے کو ملیں گی —؟ اف —— مجھے اپنی آنکھوں میں تیز جلن محسوس ہونے لگتی۔ لیکن انھیں اس سے کیا مطلب؟

ان سے عمر میں کہیں چھوٹے لڑکے ان پر جان دینے کو تیار تھے۔ ہزاروں بار شادی کی تمنا کی۔ پر وہ ایسی کٹھور کہ آئندہ سوچا جائے گا کہہ کر سب کو ٹال دیا پھر بھلا میرا کیوں خیال کرتیں ——؟ انہیں دور سے تکنے والی ایک حسن پرست لڑکی اور بس —

چند دن بعد ایک چھوٹے سے شہر میں انہیں ہیڈ مسٹریس کی جگہ پر بلانے کا خط آ گیا۔ بہت خوش ہوئیں اور باقی چھٹی کے دن اپنے کپڑے درست کرنے اور سامانِ سفر خریدنے میں گذار دیئے اور اسکول کھلتے ہی چلی گئیں۔ مجھے ان کا جانا بیحد شاق گزرا مگر ان کو روکنا بھی اپنے بس کی بات نہ تھی۔ جانے کے چند دن بعد ان کا خط آیا۔ وہاں بہت خوش تھیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے رہنے کے لئے استانیوں کو ایک بہت ہی شاندار کوٹھی ملی ہوئی تھی جس کے آگے باغ بھی تھا اُنہوں نے اپنے باورچی کی بہت تعریف کی تھی کیونکہ وہ گوشت اور ٹوسٹ بہترین تیار کرتا تھا۔ مجھے اپنے پاس بلانے کی دعوت بھی دی تھی لیکن یہاں کسے فرصت۔ انہیں معذرت کا خط لکھ دیا۔ پھر ان کے خط برابر آتے رہے۔ جن سے ان کی خوشیوں کا پتہ چلتا تھا لیکن اس کے بعد ایک دم نہ معلوم کیا ہوا کہ خطوط آنا کم ہو گئے اور جو دو ایک خط آتے بھی تو ان سے معلوم ہوتا کہ وہ اب رنجیدہ رہنے لگی ہیں۔ پھر اس کا سلسلہ قطعی بند ہو گیا اور یہاں یہ حال کہ خط کے لئے دل بے تاب۔ آنکھیں ان کی آنکھوں کے لئے پریشان۔ انہوں نے بھی تو کمال کر دیا کسی چھٹی میں گھر آنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ اور گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے شملہ پہنچ گئیں۔ ان کی اماں بیٹی کو یاد کر کر کے اُٹھتے

Scanned with CamScanner

بیٹھتے ہائے کرتیں۔ یوں ہی ڈیڑھ سال گزر گیا۔ اور میں پریشان ہو کر سفر کی مشکلیں جھیلتی ان کے پاس پہنچ گئی۔ وہ تنہا باغ میں ٹہل رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی دوڑیں۔

"تم! ارے کیسے آپڑیں شہلا ---؟"

"خوب آتی کیسے --- ریل پر بیٹھی تھی اور کیا پیدل ---!"

"اوہ! شریر۔ اچھا اندر چلو!" وہ کچھ بولائی سی ہو رہی تھیں۔ آنکھوں میں گہرے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر بے شمار سلوٹیں اور سر میں آگے ہی بہت سے سفید بال۔ میں انہیں دیکھ کر چکرا گئی۔ یا اللہ --- ڈیڑھ سال میں یہ انقلاب --- مجھے اپنی آنکھوں میں تیز جلن محسوس ہونے لگی۔

"بیٹھو!" انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گئی اور وہ بھی کٹی پتنگ کی طرح دوسری کرسی پر ڈھئے گئیں۔ میں نے ہر طرف نظر دوڑائی۔ کمرے کی ہر چیز بڑی بُری طرح پڑی ہوئی تھی۔ کتنا خوبصورت کمرہ اور اس کی یہ گت۔ اگر مجھے مل جائے تو نہ معلوم کیا بنا دوں --- میں نے سوچا اور پھر ان کو دیکھا تو وہ مجھے بٹھا کر بالکل مطمئن ہو رہی تھیں۔ اس لئے میں برابر کے کمرے میں گونجتی ہوئی مہین مہین آوازوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جو عجیب سا رومان پیش کر رہی تھیں۔

"کہو گھر میں تو سب خیریت ہے ---؟"

"یہ سب بعد میں پوچھئے گا پہلے چائے پلوائیے۔"

"ہاں ہاں! بس اب چائے کا وقت بھی آرہا ہے!"

کسی کمرے میں گراموفون سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی۔ "پیا ملن کو جانا"!
آہ! کیسی رومانی جگہ ہے یہ ــــ میرا دل چاہا کہ آنکھوں کو بند کر کے ہر طرف
سے غافل ہو جاؤں۔ لیکن وہ کچھ بے چین سی ہو کر کرسی پر کسمسانے لگیں۔ میں نے
چاہا کہ ان کی بے چینی کی وجہ تاڑ لوں مگر ان کے چہرے پر وحشت کے سوا کچھ نہ نظر
آیا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم نے چائے کا سامان لا کر میز پر لگا دیا وہ میز کے گرد پڑی ہوئی
کرسی پر کھسکیں اور میں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ دوران سفر میں کئی بار خیال آیا تھا کہ
چائے کے وقت پہنچ رہی ہوں ٹوسٹ کھانے کو ضرور ملیں گے۔ لیکن یہاں
وہی نہ تھے اور تمام الم غلم چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

"تمہارے لئے ٹوسٹ منگاؤں ــ؟"

"اور کیا آپ نہ کھائیں گی ــ؟"

"اب دل بھر گیا اس لئے نہیں کھاتی!"

"تو پھر ہٹائیے، میں بھی نہ کھاؤں گی"! میں نے دوسری چیزیں بس ٹونگ
کر چھوڑ دیں۔

"اس کوٹھی میں اور کتنی انسانیاں رہتی ہیں ــ؟" میں نے پوچھا۔

"آٹھ"! وہ کچھ بیزار ہو گئیں۔

"ان سے تو آپ ملتی ہوں گی ــ؟"

"ہاں! ملتی تھی پر اب دل نہیں چاہتا"۔ میں نے انہیں حیرت سے دیکھا
وہ اور بھی زیادہ بیزار ہو رہی تھیں۔ میں چائے پی کر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی ــــ
پھولوں کی خوشبو میں بسا ہوا ہوا کا ایک جھونکا آ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ چند منٹ بعد

وہ بھی میرے پاس آگئیں۔

"کیسی خوبصورت کوٹھی ہے خصوصاً یہ باغ"۔

"ہوگا، مجھے تو اب یہ کچھ نہیں اچھا لگتا"! انہوں نے کھڑکی بند کر لی۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بیٹھا دیا۔

"توبہ! یہ کس قدر بد مذاق ہوگئی ہیں ——"؟ میں نے دل میں کہا۔

"پیا ملن کو جانا" کسی نے پھر وہی ریکارڈ لگا دیا۔

"یہ ریکارڈ مجھے پاگل کر دے گا"! وہ سرخ ہو کر بولیں اور کرسی پر پہلو بدلا —— لاحول ولا انھیں دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں —— میں نے سوچا۔ خیر پیا سے تو وہ پہلے ہی بھاگتی تھیں پر اب کوٹھی۔ باغ۔ گوشت۔ ٹوسٹ اور حسین لڑکیوں سے بھی نفرت ہوگئی۔ میں کہتی ہوں کہ ابھی خیر ہے۔ پیا کی قدر کر لیں ورنہ پھر ہاتھ ملیں گی"۔ میں نے غور سے ان کے سفید بال دیکھے۔

"کون بجا رہا ہے یہ ریکارڈ"؟

"مسز نسیم! کل سنیچر ہے۔ اسکول کی ڈیوٹی کے بعد یہ ادھر ہی سے اپنے شوہر کے پاس چلی جائیں گی۔ ایک دو گھنٹے کا سفر ہے۔ اتوار کی رات کو واپس آجائیں گی۔ بس اسی خوشی میں بار بار یہ ریکارڈ بجایا جا رہا ہے"! ان کے لبوں سے کئی آہیں نکل گئیں۔

"اور استانیاں بھی اپنے شوہروں کے پاس جاتی ہوں گی۔"؟

"اور کسی کی شادی ہی نہیں ہوئی۔"! وہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگیں۔

"اگر تم ٹہلنا چاہو تو باغ میں چلو"۔

Scanned with CamScanner

"ضرور!" میں کھڑی ہوگئی اور ان کے ساتھ آہستہ آہستہ ٹہلتی ہوئی باغ میں آگئی۔ وہاں پہلے ہی سے چھ عورتیں اِدھر اُدھر گھاس پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان سب سے میرا تعارف کرایا گیا۔ آتے وقت جب میں نے انہیں دور سے دیکھا۔ تو وہ سب خاصی نظروں کی آوارگی کا سامان معلوم ہوئیں لیکن نزدیک سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ سب کی عمریں ڈھلی ہوئی ہیں اور چہروں سے ایک عجیب سی وحشت ٹپک رہی تھی۔ میں نے مسز نسیم کے کمرے کی طرف دیکھا لیکن نظریں دروازے پر پڑے ہوئے رنگین پردوں میں الجھ کر رہ گئیں۔ ہاں۔ "پیا ملن کو جانا" ایک ساں بجائے جا رہی تھیں۔ میں نے سب استانیوں سے تھوڑی دیر تک تو بہت ہی اخلاق سے باتیں کیں لیکن ان کی وحشت سے جلد ہی دم لوٹنے لگا۔

خدایا یہ سب کی سب وحشی کیوں ہیں ــــ؟ شاید مسز نسیم بھی ایسی ہی ہونگی۔ جبھی تو ایک ہی ریکارڈ کو بار بار گھسے جا رہی ہیں۔ میں نے سوچا اور پھر اٹھ کر بھاگنا ہی چاہتی تھی کہ ریکارڈ بجنا بند ــــ اور مسز نسیم باہر ــــ بڑی ہی ٹھاٹھ دار ساری پہنے، کوئی پینتالیس سال کی ہوں گی۔ جب وہ میرے قریب آئیں تو میں سب کچھ بھول بھال کر ان کا چہرہ گھورنے لگی کہ وحشت کا حال معلوم ہو جائے مگر واہ ــــ بڑا ہی پرسکون، پیارا سا چہرہ ــــ ان سے بھی میرا تعارف کرایا گیا۔ اور وہ میرے قریب بیٹھ گئیں پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اس کے بعد وہ خوش ہو ہو کر مسٹر نسیم کا ذکر کرنے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی شادی کو صرف دو سال ہوئے ہیں۔ اور مسٹر نسیم ذرا ضعیف ہیں۔ اس لئے وہ ہر سنیچر وار کو خود ہی ان کے پاس چلی جایا کرتی ہیں۔ انہیں آنے کی زحمت نہیں دیتیں۔

میں مسز نسیم سے باتوں میں کچھ ایسی لگی۔ کہ تمام استانیاں اپنے اپنے کمروں میں کھسک گئیں صرف وہ سر جھکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھیں اور کبھی کبھی مسز نسیم کو انتہائی بیزاری سے دیکھ لیتیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا۔ کہ آخر مسز نسیم سے بیزار ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے ــــ؟ بے چاری کتنی تو اچھی ہیں خصوصاً ان کے بات کرنے کا طرز ایسا معلوم ہوتا۔ کہ ان کے منہ میں کوئی میٹھی سی چیز دبی ہوئی ہے۔ جس کے چٹخارے لیتی جا رہی ہیں ــــ تھوڑی دیر بعد میں مسز نسیم سے اجازت لیکر ان کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کیونکہ کچھ خنکی ہو رہی تھی ــــ!

رات کے کھانے پر پھیکی سیٹھی ترکاریاں نصیب ہوئیں۔ میں نے پانی کے گھونٹوں سے چند نوالے پیٹ میں ڈھکیل لئے۔

"صبح تمہارے لئے گوشت پکوا دوں گی!" انہوں نے سمجھ لیا کہ نوالہ تر ہونا چاہئے۔

"اور کیا اب آپ نہیں کھاتیں گوشت ــــ؟" میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"نہیں بھئی! اب دل بھر گیا!" انہوں نے بیزاری سے مجھے دیکھا۔

"یعنی جو چیزیں آپ کو پسند تھیں ان سب سے جی بھر گیا ــــ؟

"ہاں! ان سب کا بس ایک وقت تھا!"

"تو اب وہ وقت کہاں چلا گیا ــــ؟"

"بس چلا گیا۔ اب تو جس چیز سے نفرت تھی اسی کو دل چاہتا ہے!"

"یعنی آپ شادی کرنا چاہتی ہیں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا انہیں
نفرت جو تھی شادی کے نام سے اس لئے ۔۔۔

"ہاں!"

"ہاں! تو ضرور کیجئے" میں اچک پڑی۔ اللہ کتنا موٹا کافر مسلمان ہوا۔
"کس سے کروں ۔۔۔؟ جو لوگ میرے متمنی تھے سب کی شادیاں ہو گئیں
اب تو کوئی نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ سفید بال ۔۔ کیا تم میرے
سر میں نہیں دیکھتیں ۔۔۔؟ ان کی وجہ سے!" وہ بےحد رنجیدہ ہو گئیں۔
"یہ تو کوئی بات نہیں۔ آپ کا ہم عمر ضرور آپ سے شادی کی التجا کرے گا"۔
"کیا معلوم! مجھ سے تو بہت لوگ ملے، سب یوں ہی سرسری طور پر کسی
نے بھی تو شادی کی التجا نہ کی۔ اب میں کسی کے آگے ہاتھ تو جوڑنے سے رہی"۔
وہ بے چین ہو کر کرسی سے اُٹھیں اور صوفے پر دراز ہو گئیں۔

اف! سفید بالوں میں کیا بالکل کشش نہیں ہوتی ۔۔۔؟ چاندی کے
زیوروں کی طرح جھلملاتے ہوئے سفید بال کیا کسی کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتے
۔۔۔؟ اوہ! ایک وقت وہ تھا کہ یہ مرد کی پروا ہی نہ کرتی تھیں پھر ایک وقت
وہ آیا کہ جہاں ان کے سامنے کسی مرد کا پیغام آیا تو ہزار نخرے کرتی تھیں۔ وہ
کون ہے ۔ وہ کیا کرتا ہے، لاحول ولا، مجھے شادی ابھی نہیں کرنا چاہئے،
اس آدمی میں رکھا ہی کیا ہے بالکل فضول سا ۔۔۔ اور اب وہ وقت آ گیا۔
کہ کوئی نہیں ملتا۔ کہاں سے لاؤں ۔۔۔؟ یہ سب کیا ہے خدایا ۔۔ میرا دم
الجھنے لگا۔

Scanned with CamScanner

"آپ کی شادی ضرور ہوگی!" میں نے انہیں تسلی دینا چاہی۔

"باتیں نہ بناؤ شہلا!" وہ مضطرب ہوکر ٹہلنے لگیں۔

"سو جاؤ، رات بہت آگئی!" اُنہوں نے مجھے حکم دیا۔

"اب آپ بھی سو جائیے!"

"ابھی نیند نہیں آرہی ہے!"

"لیٹئے گا تو ضرور آجائے گی!" میں نے اپنے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میں جب ٹہلتے ٹہلتے تھک جاؤں گی تب نیند آئے گی۔ اور اگر یوں ہی بستر پر پڑ کر زیادہ دیر جاگوں گی۔ تو جسم میں ایک چبھن سی محسوس ہوگی!" چبھن ---- یا اللہ! یہ چبھن کیوں ہوتی ہے ---- ؟ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اور تھکن کی وجہ سے فوراً ہی نیند آگئی۔ وہ نہ معلوم کب تک ٹہلا کی ہوں گی۔

صبح اُنہوں نے مجھے جلدی ہی اُٹھا دیا۔ وہ اسکول جانے کے لئے تیار تھیں اور چائے کا سامان میز پر چنا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے منہ دھویا اور کپڑے تبدیل کرکے ان کے ساتھ چائے پینے لگی۔

"میرے جانے کے بعد تم اکیلے گھبراؤ گی؟"

"نہیں! مجھے تنہائی بہت پسند ہے!"

"لیکن میں تو اب تنہائی سے بہت اکتا چکی ہوں۔ اچھا خدا حافظ!"

"خدا حافظ!" وہ رومال سے منہ پونچھتی ہوئی چلی گئیں۔ اور بھی استانیاں جا چکی تھیں۔ کیونکہ کوٹھی میں ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ ملازمین انتہائی خاموشی سے

اپنے کاموں میں منہمک تھے۔ صرف کسی کسی وقت برتنوں کی کھڑ بڑ سنائی دے جاتی۔ میں نے وقت گزاری کے لئے مطالعہ شروع کر دیا۔ اور جب وہ واپس آئیں تو ان کے ساتھ مسز نسیم بھی تھیں۔ بہت بولائی ہوئی اور سب استانیوں کی طرح چہرے پر سخت وحشت۔ میں سوچنے لگی کہ یہ ان کا سکون کون کمبخت چھین لے گیا ——؟

"آپ گئیں نہیں مسٹر نسیم کے پاس۔؟"

"نہیں پیاری کہاں جا سکی، تمہاری انھوں نے آج اسکول کا اتنا زیادہ کام دے دیا۔ کہ کل دن بھر کرنا ہوگا!" انھوں نے جلدی جلدی کہا اور چہرے پر وحشت کچھ زیادہ ہو گئی۔

"آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں"۔ مجھے اپنی "ان پر" غصہ آگیا۔ کہ آج ہی غریب کو کام دینے کو تھا تا کہ وہ مسٹر نسیم سے نہ مل سکیں۔ تو یہ یہ عورتیں عورتوں سے کبھی ہمدردی نہیں کر سکتیں۔ ہیڈ مسٹریس ہو کر سر پر ناچنے لگیں۔ لاحول ولا۔

"پریشانی کی بات ہی ہے پیاری، ہفتے میں ایک بار تو ان کے پاس جاتی ہوں"۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے"! میں نے متاثر ہو کر کہا۔ بھلا اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ ویسے تو حقیقتاً مجھے ان سے ہمدردی ہو رہی تھی لیکن ان کی وحشت سے وحشت بھی —— غٹرغوں —— غٹرغوں —— میری نظر برآمدے کی طرف اٹھ گئی جہاں مسز نسیم کا پالتو کبوتر اپنی کبوتری کے گرد پیار سے چکر کاٹ رہا تھا۔ اور کبوتری بڑی مسکینی سے اس کا پیار دیکھ رہی تھی۔ مسز نسیم

ایک زور کی آہ بھر کر کھڑی ہو گئیں۔

"اچھا اب چلی ڈارلنگ"۔ میں بھی کھڑی ہو گئی۔ وہ کبوتر پر ایک نظر ڈالتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ اور میں نے سوچا کہ بوڑھوں پاس بس ہوس ہی ہوس رہ جاتی ہے۔ بھلا کبوتری سے متاثر ہونا ان کے لئے کب جائز ہے۔

"اس کبوتری کی زندگی مجھ سے اچھی ہے۔ یہ گوشت۔ ٹوسٹ۔ کوٹھی اور باغ کی پروا نہیں کرتی۔ لیکن کتنی خوش ہے"۔ انہوں نے مجھے بیزاری سے دیکھا اور میں کوئی جواب نہ دے سکی۔

دوسرے دن میں اپنے گھر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ کیونکہ سب کی وحشت دیکھ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں بھی اب وحشی ہوئی اور اب ہوئی۔ چلتے وقت سب استانیاں اپنی اپنی وحشت کے ساتھ مجھے تانگے تک چھوڑنے آئیں اور وہ اسٹیشن تک۔ جب گاڑی چھٹنے میں چند منٹ رہ گئے تو میں نے چپکے سے کہا۔

"آپ کی شادی ضرور ہو گی، لیکن مجھے بھول نہ جائیے گا"۔

"تم بھی دعا کرنا کہ کوئی مجھے پوچھ لے"۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور سیٹی کی پاردار آواز نے انہیں چند قدم پیچھے ڈھکیل دیا۔

"خدا حافظ! شہلا پیاری"۔

"خدا حافظ!" ایک دھکے کے ساتھ ٹرین چلی اور دور تک ان کا رومال کانپتا ہوا دکھائی دیتا رہا اور پھر شام کے دھندلکے میں ریل چنگھاڑتی جنگلوں

Scanned with CamScanner

سے گزرتی چلی جارہی تھی اور مجھے ڈبے کے ہر مرد وعورت پر نہ معلوم کیوں وحشت برستی ہوئی معلوم ہورہی تھی ــــ

میں نے خدا سے خوب گڑگڑا کر ان کے لئے دعائیں کیں۔ ویسے تو اللہ میاں ذرا کم ہی سنتے ہیں لیکن وقت دعا شاید موڈ میں تھے جو فوراً قبول کرلیں۔ دو ماہ بعد وہ اپنے گھر آئیں۔ بہت بولائی ہوئی۔ ان کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ جو صورت سے خوب کھایا کھیلا معلوم ہوتا تھا اور شاید اسی کھانے کھیلنے کے سلسلے میں آگے کے دو دانت بھی شہید ہوگئے تھے۔ انہوں نے مجھے چپکے چپکے بتایا کہ ان کے ساتھ والے کا نام احمد ہے۔ جسے بڑی مشکل سے شادی پر آمادہ کیا ہے۔ ورنہ وہ تو اس عمر میں بھی ایک جوان لڑکی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اور پھر انہوں نے مجھ سے اچھی نبھنے کی دعا کرنے کو کہا۔

دوسرے دن ان کی اماں نے ان کی شادی کردی گو وہ اپنے ہم عمر داماد سے ذرا کھسیائی ہوئی سی تھیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میری لمبی لمبی آنکھوں والی کا چہرہ بڑا ہی پرسکون تھا۔ ایسا پرسکون کہ مجھے پھر ایک بار ان پر محبت آگئی۔ پر اب انہیں فرصت کہاں ــــ ؟

ان کی شادی کو اب بہت دن ہو چکے ہیں لیکن نہ معلوم کیوں میں یہ اکثر سوچا کرتی ہوں کہ آخر انہوں نے سب کچھ کھو کر کیا پایا ــــ ؟

Scanned with CamScanner

جوانی

سلگتی ہوئی سیلی لکڑیوں سے بل کھاتا ہوا دھواں باورچی خانے کے چھوٹے سے روشندان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور وہ چولھے کے پاس پتائی پر بیٹھی ہوئی اپنی تیز تیز جلتی ہوئی سانسوں سے سیلی لکڑیوں میں شعلے بلند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر جوانی کی جلتی ہوئی پھونکیں شعلے بلند کر کے رہیں۔ چولھے پر دھری ہوئی کھچڑی کھدر بدر ہونے لگی اور وہ میلی دھندلی دیوار کا سہارا لیکر بیٹھ گئی۔ مارے گرمی کے پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ چھدری چھدری پلکوں پر دھواں لگنے سے موٹے موٹے آنسو کانپ رہے تھے۔ اور بار بار جھک کر پھونکنے سے ران پر سے چست پاجامہ مسک گیا تھا۔ اس نے اطمینان کی کئی طویل سانسیں لیں اور آنکھیں ہولے سے موند لیں۔ کھدر بدر۔ کھدر بدر — دال چاول آپس میں لڑ رہے تھے۔ کوئی لونڈا ابچھواڑے کی گلی سے گاتا ہوا جا رہا تھا۔ "پیا آن ملو"

وہ تپائی سے اٹھی اور طاق میں رکھے ہوئے چراغ کو دیا سلائی چھوا کر گانے کے بول دہرانے لگی اور پھر پیا کا مطلب سوچ کر مسکرا دی۔ اس کے سارے جسم میں پیا کے تصور ہی سے چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ کھچڑی میں ایک زور کا ابال آیا۔ لیکن وہ دھوئیں میں گھٹی ہوئی آواز سے گائے گئی۔ پیا آن ملو ــــ

روشندان سے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا۔ اور روشندان سے باہر نکلنے والا دھواں سانپ کی طرح بل کھا کر باورچی خانے میں لہریں لینے لگا۔ جیسے کہ وہ اس کے "پیا آن ملو" کی بازگشت تھا ــــ کھچڑی کا ابال خود ہی ختم ہو گیا اور پانی خشک ہونے کی وجہ سے کھچڑی نیچے سے جلنے لگی۔ لیکن وہ پیا کے رسیلے تصور میں ایسی غرق تھی کہ کچھ خبر ہی نہ ہوئی۔

"ہائے مِٹّن ــــ کیا ساری کھچڑی جلا دی؟" اس کی ماں جلن کی بو محسوس کر کے زور سے غرّائی اور اس کے ہلتے ہوئے لب آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے سے مل گئے اور پیا آن ملو اس کے حلق میں قید ہو گیا۔ اس نے لکڑیاں آگے کھینچ کر جلدی سے پتیلی اتار لی اور باورچی خانے سے نکل کر صحن میں پڑے ہوئے جھلنگا کھاٹ پر پڑ رہی ــــ اس کی بھابی اپنے موٹے تھل تھل جسم سے کرتا ہٹائے دو سالہ مسٹنڈے ننھے کو دودھ پلا رہی تھی اور ماں اب تک کھچڑی جلنے پر کھر کھر کئے جا رہی تھی۔ وہ بھی منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی ــــ

"جل گئی کھچڑی تو کوئی کیا کرے ــــ ذرا سے نقصان پر ہزاروں باتیں پڑتی ہیں۔ دونوں وقت پکا کر سب کو ٹھنساؤ۔ پھر بھی کسی کا منہ نہ سیدھا ہو۔ اگر میں بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہوں تو ایک ہی دن میں فاقے پڑ جائیں۔ بس پھر

طبیعت درست ہو جائے۔ آرام کر کر کے سب کے دماغ خراب ہو گئے ہیں۔"

"کیا تجھے کھانا نہیں کھانا ہے ـــــ؟" ماں نے پوچھا۔

"نہیں کھانا ہے۔" دوپٹے سے منہ چھپا کر اس نے ماں کی طرف سے کروٹ لے لی۔

"نہ کھا۔ نامراد۔" ماں اس کی بھابی کے ساتھ کھانے بیٹھ گئی اور ہر نوالے کو پیٹ میں ڈھکیل لینے کے بعد بیٹی پر غراتی جا رہی تھی۔ اس نے کبھی ماں کو جواب نہ دیئے تھے۔ اور اب جبکہ وہ ہر بات پر ماں کو ٹکا سا جواب پکڑا دیتی تو غریب بڑھیا پہر دن بڑبڑایا کرتی ـــــ ابھی چند ہی دن پہلے کی تو بات ہے جب وہ بھابی کے ہر وقت ریں ریں کرتے ہوئے ننھے کو کولھے پر لادے رہتی۔ باپ کی منٹ منٹ پر چلمیں بھرتی۔ اماں اور بھابی کے پرانے کپڑوں پر پیوند لگاتی۔ غرض سارا دن یوں ہی گزر جاتا اور وہ منہ سے اف نہ کرتی۔ لیکن اب جیسے اس کی زندگی ہی بدل گئی تھی۔ ذرا ذرا سے کام پر بھنبھنایا کرتی۔ بھابی کا ننھا اس کے کولھے پر سواری کرنے کے لئے رویا کرتا اور وہ اس کی طرف دیکھتی بھی نہ تھی۔ باپ کی چلمیں بھرتے بھرتے کچیا کر توڑ دیا کرتی۔ اماں اور بھابی کے لتے لگ گئے۔ لیکن اس نے جیسے سوئی نہ پکڑنے کی قسم کھا رکھی تھی اور ماں کے زیادہ چیخنے چلانے پر خود بھی بڑبڑانے لگتی۔ اماں بھائی بھابی اور ننھے سب ہی سے اسے نفرت ہو گئی تھی۔ رات کے دو دو تین تین بجے تک جاگ کر کروٹیں بدلا کرتی۔ سارے جسم میں ٹیسیں سی اٹھتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ دل زور زور سے دھڑکا کرتا اور وہ پڑی سوچا کرتی۔ کہ آخر اسے یہ سب کچھ ہوتا کیا جا رہا ہے۔ اگی

ماں یہ خوب جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ لیکن انجان بنی ہوئی تھی۔!
آج دو سال بعد اس کا بھیا کلکتہ سے آیا ہوا تھا۔ بیچارے کو بہت تھوڑی چھٹی ملی تھی۔ اس لئے دوسرے ہی دن جانے والا تھا۔ اماں نے خوشی سے نہال ہو کر بیٹے کے لئے کئی طرح کے کھانے پکوائے، ابا نے چلمیں بھروائیں اور بھابی شوہر کو کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر سرخ آنکھوں میں لال لال ڈورے۔ اماں۔ ابا بیٹے کے پاس بیٹھے نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں کر رہے تھے۔ بھابی بھی دور رہی سے ایک آدھ بات بول دیتیں اور جب اس کا بھیا اماں۔ ابا کی آنکھ صفائی سے بچا کر بیوی کو دیکھ کر ہنستا تو اس کی نظر پڑ جاتی اور وہ سوچنے لگتی کہ جانے اس کے ہاتھ کب لال ہوں گے۔ گھر میں اس کی شادی کی تو جیسے کسی کو فکر ہی نہیں۔ وہ کب سے سنتی چلی آ رہی ہے۔ کہ اس کا بھیا شادی کا انتظام کر رہا ہے۔ آئندہ سال ضرور ہو جائے گی لیکن آئندہ سال آکر چپکے سے چلا بھی جاتا اور بات پھر آئندہ سال پر اٹھا رکھی جاتی۔
جب تک بھیا پردیس میں رہے تو کبھی کبھی تین پیسے کے کارڈ پر اس کی شادی کی بات، یاد دلا دی جاتی۔ اور آج جبکہ اس کا بھیا آیا ہوا ہے تو کوئی اس کی شادی کا نام تک نہ لے۔ سب اپنی اپنی ہانکے جائیں۔
شام کو وہ کام سے تھک کر اپنے پلنگ پر پڑ رہی۔ اس کی ماں بیٹے کے پاس میٹھی باتیں کر رہی تھی اور باپ بھی قریب ہی میٹھا چلم سے دھوئیں کے بادل اڑا رہا تھا۔ بھابی اپنے ریں ریں کرتے ہوئے ننھے کو گود میں لئے ٹہل ٹہل کر چپ کرا رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

"تیری تو بٹن کمر ہی ٹوٹ گئی۔ جب دیکھو لیٹی ہوئی ہے۔ ذرا اٹھ کر صحن میں الگنی باندھ کر پردہ ڈال دے۔ تیرا بھیا ادھر ہی لیٹے گا۔ گرمی کے دن سب ہی تو ننگے کھلے سوتے ہیں۔ اور پھر ذرا کھانا بھی نکال دے۔ کھاپی کے وہ سو رہے ہے"۔ ماں کو اس کا لیٹنا اچھا نہ لگا۔ اور اس نے جلدی سے کام بتا دیئے اور وہ بدبداتی ہوئی اٹھ گئی۔

"کہاں سے لاؤں الگنی؟"

"اری میرے پلنگ سے ادوائن نکال کر باندھ دے"۔ ماں نے کہا۔

"آپ جھولیں گی رات بھر جھولا۔ پر بیٹے کی محبت میں سب جائز ہے"۔

اس نے بڑبڑاتے ہوئے پلنگ سے ادوائن نکال کر الگنی باندھ دی اور پھر کھانا نکال کر بھائی کے سامنے رکھ دیا۔ اماں ابا نے بیٹے کے ساتھ ہی کھایا۔ اور وہ بھابی کے ساتھ چند نوالے کھا کر پڑ رہی۔ بھابی نے اپنے "ان کے" لئے بستر لگایا اور پھر بٹن کے قریب بچھے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ ننھے ایک سال ریں ریں کئے جا رہا تھا۔ اس نے جھلا کر اس کے منہ میں دودھ ٹھونس دیا۔ اور پیٹھ پر تھپکیاں دے کر سلانے لگی۔ صحن میں جگہ کم ہونے کی وجہ سے باپ اپنا پلنگ باہر گلی میں اٹھا لے گیا۔ بھیا بھی اپنے بستر پر دراز ہو کر کروٹیں بدلنے لگا۔ بھابی ننھے کو سلاتے سلاتے خود بھی اونگھنے لگی۔ اور ماں اپنے جھولا پلنگ پر لیٹی آنکھیں بند کئے کچھ بدبدا رہی تھی۔ یہ اس کی عادت تھی کہ جب تک سو نہ جائے ہونٹ ہلا ہی کرتے۔

"بھابی!" اس نے چپکے سے پکارا۔ سر شام سناٹا چھا جانے سے اس کا

Scanned with CamScanner

دم الجھنے لگا۔

"اوں۔اوں" اس کی بھابی زور سے سانسیں لینے لگی۔

"روز تو رات گئے تک باتیں کرتی تھیں، آج شام ہی سے نیند سوار ہو گئی؟"

"تم بھی سو جاؤ" وہ نیند میں بڑبڑائی۔

"تم بھی سو جاؤ" اس نے غصے سے بھابی کی بات دہرائی۔ شام ہی سے موت کی نیند چھا گئی۔ خوش جو بہت ہیں نا۔۔۔ اور یہ اماں بارہ بجے تک ٹرٹر کیا کرتیں آج ہونٹ سل گئے" اس نے کروٹ بدلی اور پلنگ کی ڈھیلی چولیں چچیائیں۔

"اری کمبخت اب سو جا نا۔ یہ تجھے راتوں کو جاگنے کی کیا لت پڑ گئی ہے۔ کوئی دیکھے یوں جاگتے تو کیا تھوکے رنڈی کو" ماں اونگھتے سے چونک کر کھڑکھرائی۔ اور وہ دم سادھ کر چیت لیٹ گئی۔

"بھیا نہ ہوتے تو بتاتی رنڈی کہنے کا مزہ۔ بڑھاپے میں نہ جانے یہ غرّانے کی عادت کیوں ہو جاتی ہے۔۔۔؟ اللہ ہی جانے کب پیچھا چھٹے ان سب سے، زندگی اجیرن ہو گئی۔ لیکن بھلا پیچھا ہی کیوں چھٹنے لگا۔۔۔ اس کا بھیا تین پیسے کے کارڈ میں اس کی شادی کے متعلق لکھ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے، ماں نے شادی کے نام سے دو جوڑے کپڑے سی کر رکھ لئے ہیں چلو فرصت ہو گئی۔ اس کی شادی پر تو کیا کفن کے ساتھ جائیں گے وہ جوڑے اُفوہ۔۔۔ اس کا بھیا اگر بس چلے تو دس بیویاں اور کرے۔ اور یہ اماں۔ بن پڑے تو اس بڑھاپے میں میاں کے کولھے سے کولھا جوڑے رہیں۔ لیکن اس کی

کسی کو فکر نہیں ــــ اس نے سوچتے سوچتے آہستہ سے کروٹ بدلی اور اپنے کسکتے ہوئے جسم کو سکیڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد اس پر ایک میٹھی سی غنودگی طاری ہونے لگی۔ لیکن کسی کے ہولے ہولے سلیپرس پہننے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کی بھابی چوروں کی طرح اپنے پلنگ کے پاس کھڑی اسے اور ماں کو چراغ کی مدھم سی روشنی میں گھور گھور کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ بھابی کو آواز دے۔ لیکن سوچ کر چپ ہو رہی کہ اس کی بھابی اس سے یہ نہ پوچھ بیٹھے کہ تم اتنی رات تک سوئیں کیوں نہیں ــــ؟

اس نے بھابی کے منہ سے سو بار سنا ہوگا کہ جوان لڑکیوں کا رات کو جاگنا بڑا عیب ہے۔ اور پھر اگر ماں نے اس کی آواز سن پائی تو نہ سونے پر اسی وقت سڑی سڑی گالیاں سنائے گی۔ کہ محلے والے چونک پڑیں۔ وہ بے سدھ چت پڑی بھابی کو کنکھیوں سے دیکھتی رہی اور وہ بھی دونوں کو گھورتی رہی۔ پھر ایک دم ادھر سرک گئی جہاں اس کا بھیا سو رہا تھا۔

"ہوں!" اس نے چپکے سے اپنے پاؤں سکیڑ لیئے۔ بھابی اور بھیا کے کھسر پھسر کرنے کی آواز آنے لگی تو اس نے اپنے کان ادھر لگا دیئے۔ لیکن ان کی ایک بات بھی اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن وہ یہ خوب سمجھ گئی۔ کہ آج سر شام سب پر سلائی کیوں سوار ہوگئی تھی اور اسے جلد سو جانے کی تاکید کیوں کی جا رہی تھی۔ اسے اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں ــ اور آنکھیں پردے پر گڑ گئیں۔

Scanned with CamScanner

"ہائے اللہ"! اس کے لب آہستہ سے ہلے ۔ماں نے کروٹ بدلی اور اس نے ڈر کر اپنا منہ دوپٹے سے چھپا لیا ۔ افوہ — اس کی ایک دبی سی ہائے اللہ پر ماں کروٹ بدلے اور یہ سلیپر یوں پہننے کی سٹ پٹ اور رات کے سناٹے میں بھنبھناتے ہوئے بھونروں جیسی آوازیں اسے پلنگ سے نہیں کھڑا کر دیتیں — ؟ وہ اپنی بے بسی پر ایک ہلکی سی سسکی لے کر رہ گئی۔رات دبے قدموں گزرتی جا رہی تھی ——!

چولھے پر رکھا ہوا گوشت کھدر بدر پک رہا تھا اور وہ تپائی پر آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ اس کے دل و دماغ پر ایک پر کیف دھند چھائی ہوئی تھی ۔کل رات کے مشاہدے نے اس کے جذبات میں طلاطم پیدا کر دیا تھا۔ وہ دنیا کی ہر چیز سے بے خبر نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ کچھ بہت ہی حسین حسین سی باتیں جو اس نے اب تک نہ سوچی تھیں ادھر آگ گوشت کے پانی کو جلا کر گوشت جلا رہی تھی۔

" ہائے کیا گوشت جلا ڈالا تو نے —؟ جلن کی بو محسوس کر کے اس کی ماں غراتی ہوئی باورچی خانے کی طرف جھپٹی ۔اور وہ اپنے خیالات سے چونک پڑی۔

" اری حرام زادی تجھے یہ ہو کیا جا رہا ہے — ؟ رنڈی میں تیرے گن خوب سمجھ رہی ہوں ۔جب دیکھو جب گھنوں کی طرح چپ بیٹھی رہے چاہے گھر میں آگ ہی کیوں نہ لگ جائے۔ ہائے چھتیسی نے کیسا ناک چنے چبوائے ہیں۔ ابھی کسی کے ساتھ دھکیل دوں تو سب پتہ چل جائے"۔ ماں نے ایک ہی سانس میں پوری کتھا سنا ڈالی ۔ اس کی بھابی بھی چیخ پکار سن کر اپنے ننھے

Scanned with CamScanner

کو لادے آگئی۔

"کیا سارا گوشت بھسم ہو گیا؟" بھابی نے ننھے کو ٹھیک سے کولھے پر جماتے ہوئے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا بچ گیا وہ تو ہرجائی بے خبر بیٹھی تھی۔"

"چلو ٹھیک ہوا۔ اب وہ بارہ بجے جائیں گے تو کھانا بھی نہیں ملے گا۔" بھابی نے بری سی نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن وہ اتنی گالیاں سننے کے بعد بھی سر جھکائے کچھ بے خودسی بیٹھی تھی۔

"میں کہتی ہوں اماں کہ تم نے مٹن کو اب تک بٹھا کیوں رکھا ہے۔ اسکے لچھن تو یہی کہتے ہیں کہ اب ہم سے نہ بیٹھا جائے گا۔ نوج ہوئی کنواری بالی لڑکیوں کے یہ ڈھنگ ہوں۔"

"کیوں بٹھا رکھا ہے۔ کر دو نا۔ منع کس نے کیا ہے"؟ رات کا چھپایا ہوا کیف اس کے شرم سے سلے ہوئے ہونٹوں پر قینچی بن کر چل گیا۔

"ہائے"! اماں نے اپنا سینہ کوٹ لیا۔

"قیامت قریب ہے۔ کنواری اپنے منہ سے بر مانگے۔" بھابی کی انگلی ناک پر ٹک گئی۔ اور پھر وہ سینہ کوٹتی ہوئی ساس کو لے کر باہر نکل گئی اور وہ جلتے ہوئے گوشت کو الگ کر کے پتیلی صاف کرنے لگی۔ باہر دالان میں اس کی اماں اور بھیا کچھ کھسر پسر کر رہے تھے۔ اور دور بیٹھی ہوئی بھابی گھونگھٹ میں سر ہلا ہلا کر ان کی تائید کر رہی تھی۔ اس نے دیکھا اور کچھ مطمئن سی ہو گئی۔ جیسے اس کے سینے پر رکھی ہوئی بھاری سل ہٹ گئی ہو ــــــ!

یہ ہم ہیں

"ارے جناب! ادھر آئیے۔"

"جناب یہاں، ایک سے ایک بڑھیا، کہ طبیعت پھڑک جائے۔"

"اجی حضور، یہاں کرم کیجئے!"

"آپ یہاں تشریف لائیے۔"

قطار سے کپڑے کی بہت سی دوکانیں، تانگے سے اترتے ہی میں چکرا گئی، کس کی سنوں —؟ کہاں جاؤں —؟ سبھی تو اپنی اپنی دوکانوں پر اچک اچک کر چیخ رہے تھے۔ جیسے میں پوری دوکان خریدنے آئی ہوں۔ ایک چھوٹا سا پرس تو ہاتھ میں تھا جس میں دام کم اور خطوط زیادہ لیکن یہ لوگ کیا جانیں انہیں تو پرس کے مٹاپے سے کام۔

"ابے تو کرسی رکھ، آپ یہاں تشریف لائیے۔" ایک موٹا چکنا چپڑا دوکاندار

اپنی کلبلاتی توند پر پھسلتی ہوئی دھوتی سنبھالتا کھڑا ہو گیا۔ اور میں اپنی نقاب درست کرتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کس قسم کا کپڑا دکھاؤں —؟" وہ اپنی دھوتی سے جھانکتی ہوئی ران ذرا تکلف سے ڈھانکتے ہوئے مجھے گھورنے لگا، شاید وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہوگا کہ برقع کے اندر ہے کیسی چیز —؟

"چھالٹین دکھاؤ۔"

"چھالٹین ؟" وہ کچھ متحیر سا ہو گیا۔ اس کے خیال سے مجھے شمیو سلک وغیرہ دیکھنا چاہیے تھی خریدتی ایک کوڑی کی نا۔

"ہاں چھالٹین۔" میں نے زور سے کہا اور اس نے ایک کالے کلوٹے لڑکے کو اشارہ کیا جس نے کئی گھٹیا بڑھیا تھان میرے سامنے لا کر رکھ دیئے۔

"کتنے گز ہے یہ —؟" میں نے ایک اچھی سی چھالٹین کے دام پوچھے۔

"ایک روپیہ آٹھ آنہ۔"

"ایک روپیہ آٹھ آنہ ؟" میری نقاب مارے حیرت کے پھڑ پھڑا کر سرک گئی۔

"جی ہاں وہ تو کہئے کہ اب کپڑا بہت سستا ہو گیا ہے۔" وہ مجھے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اور پھر مجھے احساس ہوا کہ کپڑے کی گرانی نے نقاب کو سر پر چڑھا دیا ہے لیکن اب تو چڑھی ہی تھی پھر کیوں اتارتی ؟ بھلا یہ ذلیل سے ذلیل دوکاندار اگر دیکھیں گے بھی تو اپنا جاتا کیا ہے —؟

"کچھ کم نہ ہوں گے دام ؟"

"نہیں حضور"

"تو پھر ہم نہ لیں گے"

"آپ دیکھ لیں سرکار دوسری دوکانیں بھی۔ اگر کوئی ایک پیسہ کم لے لے تو میں مفت دوں آپ کو"

"بھئی کچھ کم کرو دام یوں کام نہ چلے گا"

"ارے جناب دام کیا کم کریں ــــــ؟ آپ مفت ہی لے لیں" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میری نقاب کشائی سے بڑا خوش نظر آتا تھا۔ اور میں اس شش و پنج میں پڑ گئی کہ کپڑا تو آخر خریدنا ہی ہے۔ کوئی ننگا تو پھرنے سے رہا۔

"حضور آجکل دنیا کی ہر چیز مہنگی ہو رہی" وہ ہر چیز پہ زور دے کر بولا۔ اور مجھے اس کی الٹی پلٹی آنکھیں دیکھ کر ایک دم خیال آیا کہ وہ بیچارے جو وقت بے وقت طوائف کے کوٹھے پر دھڑ سے پہنچ جایا کرتے تھے۔ اب ایک پیسے کا پتلا سا پھولوں کا ہار پہنے نیچے ہی کتوں کی طرح منڈلایا کرتے ہیں۔ اور طوائفوں نے بھی تو اس مہنگائی سے بڑا اثر لیا۔ اپنی قیمتیں دگنی کر دیں۔ جیسے کہ ان کا حسن و جمال بھی لڑائی پر بھیجا جانے لگا ہے۔ کمبختوں نے ذرا نہ سوچا۔ کہ اگر کوئی غریب بیوی سے لڑا تو کیا ہو گا ــــــ؟ یا جسے سرے سے بیوی اچھی ہی نہ لگے تو کیا کرے گا یا پھر وہ معصوم چھوکرے جو شادی کو غلامی تصور کرتے ہیں کیا کریں گے ــــــ؟ سب سر پیٹیں گے نا اپنا ــــــ؟ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ ہائے کیسی خوفناک مہنگائی ہے۔ اور ــــــ

"تو حضور کیا سوچا آپ نے ـــ ؟

"اوہ ـــ تو پھر پھاڑ دو آٹھ گز" میں نے گھبرا کر کہا کیونکہ برقع نے کئی آدمیوں کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اور ایک صاحب تو بالکل مجھ سے بھڑ کر کھڑے ہونے کی کوشش فرما رہے تھے لیکن اس طرح کہ جیسے مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔ اور ہوتا بھی کیسے ـــ ؟ جناب! وہ پہنے ہوئے تھے ٹخنوں سے اونچا پاجامہ اور سر پر منڈلا رہا تھا ترکی ٹوپی کا پھندنا۔

"اماں ایک پاجامے کی چھالٹین لینا ہے"۔ انہوں نے بھی میری چھالٹین پر دانت لگائے۔ اور ایک آنکھ ذرا ڈھینڈری کر کے مجھے دیکھا۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ دیکھو میری ــــــ میں نے بھی وہی کپڑا لیا جو تم نے لیا ہے اب چاہے دو دن گھر میں کھانا نہ پکے۔

"لیجئے"۔ دوکاندار نے کپڑے کا پلندہ میری طرف بڑھا دیا اور میں نے دام ادا کر کے کپڑا اپنے چھوٹے بھائی کو پکڑا دیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

"آپا جان آپ نقاب کیوں نہیں ڈالتیں"۔ چھ برس کی ننھی سی جان نے مجھے آنکھیں دکھائیں۔

"چپ گدھے"۔ مجھے تاؤ آگیا اور وہ سہم کر سیدھا ہو گیا۔

"یہ ہیں مسلمان عورتیں۔ ایسی عورتوں نے گھروں میں بیٹھنے والیوں کو خراب کر رکھا ہے۔ ذرا دیکھو میاں! برقع تو اوڑھے ہیں لیکن نقاب الٹ کر نامحرم مردوں کو دعوت نظارہ دی جا رہی ہے۔ لاحول ولا"۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو ہمارے وہی ترکی ٹوپی والے تھے جو چند منٹ پہلے

Scanned with CamScanner

مجھ سے بڑھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور اسی علت میں ایک پاجامے کا کپڑا بھی خرید ڈالا تھا، اب میرے خلاف زہر اگل رہے تھے۔ اور اس زہر اگلنے کی مشقت میں ان کی ٹوپی کا پھندنا بری طرح رقص کر رہا تھا۔ میری نقاب کانپی اور منہ پھر چھپ گیا۔

"اب آپ نے ڈالی نا نقاب" چھوٹے بھائی نے اپنی فتح محسوس کرتے ہوئے کہا۔ اور میں نے جل کر نقاب الٹ دی۔ ہم اپنی صورت ضرور دکھائیں گے تاکہ یہ کمبخت عادی ہو جائیں۔ جہاں کسی عورت کو ٹک ٹک پر دیکھا اور دم نکلنے لگا اور یہ شرعی پاجاموں والے ــــ ہائے۔ یہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح گھر کے ایک کونے میں بنے ہوئے بیت الخلا میں انسان اپنی ضرورت سے جاتا ہے۔ بس اسی طرح عورت کو گھر میں بند کر دیا جائے اور دست نیری کی۔ اپنی ضرورت پوری کی اور قصہ پاک۔ میرا دماغ غصے سے جھنا گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ اب تو پیدل ہی جا کر بھائی کے بچے کے لئے بسکٹ خریدوں گی۔ دیکھنا ہے کوئی میرا کیا کر لیتا ہے۔

"دل چاہتا ہے تصویر کھینچ لوں۔" ایک صاحب میرے پاس سے کہتے ہوئے گذر گئے۔ اف ــــ کیا چپکے سے اپنی تمنا کا اظہار کیا ہے کہ کوئی سن نہ سکے سفید پتلون، سفید قمیص۔ نیلی ٹائی۔ اگر کوئی یہ کہتے سن لیتا تو کیا کہتا ــــ ؟ یہی نا کہ بدمعاش ہے سالا۔ راستہ چلتی عورت کو چھیڑتا ہے۔ حالانکہ ایسا کہنے والے خود کب چوکتے ہیں موقع پر ــــ ؟ میں انہیں حسرت سے جاتا ہوا دیکھنے لگی۔

"ہائے چلے جا رہے ہیں بیچارے۔ بھلا کیا ملا ہوگا تصویر کھینچنے کی تمنا کر کے؟

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی ہے۔

"اب آپ کہاں چل رہی ہیں ___؟" بھائی نے پوچھا۔

"بسکٹ خریدوں گی"

"بسکٹ - میں بھی کھاؤں گا"

"دیکھا جائے گا۔ اگر تیز چلے تو کھلادوں گی"

"ہاں!" وہ بسکٹ کھانے کی لالچ میں ہانپ ہانپ کر تیز چلنے لگا۔

"تیری ان آنکھوں نے کیا بیمار ہائے" ایک صاحب جو انتہائی ٹھاٹ دار شیروانی میں ملبوس۔ نظریں جھکائے۔ بڑی شرافت سے مجھ سے کچھ دور چل رہے تھے۔ قریب ہو کر گنگنائے۔ اور میری نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ لو ابھی تک تو اچھے بھلے میرے ساتھ چل رہے تھے اور اب ذرا ہی دیر میں میری آنکھوں نے بیمار بھی کر دیا۔ ہائے ___ ہم کیسے منحوس ہیں کہ اچھے بھلوں کی بیماری کا باعث بنیں۔ مجھے اپنی ذات سے نفرت سی ہونے لگی لیکن ان کی تیمارداری بھی اپنے بس کا روگ نہ تھا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہ چند ہی منٹ بعد خود بخود اچھے ہو کر مسکراتے ہوئے غائب ہو گئے۔

"ہائے ظالم مار ڈالا"۔ ابھی ان صاحب کی مہلک بیماری کے تاثرات زائل بھی نہ ہوئے تھے۔ کہ ایک بھاری دردناک آواز نے مجھے اچھل جانے پر مجبور کر دیا اللہ ___ ابھی تو ایک بیمار سے فرصت پائی تھی کہ اب کفن دینے کی باری آگئی نہ جانے یہ آٹھ گز چھالٹین گھر تک پہنچ بھی سکے گی یا نہیں ___؟ میں نے اچٹتی ہوئی نظر سے مرجانے والے کو تلاش کیا۔ ہی ہی ___ مجھے گھن آگئی مرجانے والا

چار انگل کی لال لنگوٹ کسے، ننگے سینے پر ہاتھ رکھے کھڑا پان کھا رہا تھا۔ افوہ۔ کیا اکڑا اکھڑا تھا کہ کسی طرف سے مرنے کے آثار ہی نظر نہ آتے تھے۔ ہم تو سمجھے ہوئے تھے کہ غریب کی سانسیں اکھڑ چکی ہوں گی، خاک پر لوٹ رہا ہوگا۔ لوگ ارد گرد کھڑے کفِ افسوس مل رہے ہوں گے۔ مگر —— میری حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ کاش۔ یہ مر ہی جائے تو دیدول اپنی آٹھ گز چھالٹین اس کے کفن کو —! سامنے لبسکٹ کی دوکان نظر پڑی اور میں جلدی سے اس کے اندر چلی گئی۔ اور لبسکٹ والے نے کرسی پیش کر کے کئی قسم کے لبسکٹ میرے سامنے رکھ دیئے۔

"چکھ کے دیکھ لیجئے"۔ وہ ذرا اخلاق سے بولا اور پھر خود ہی دس بارہ لبسکٹ میرے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ میں نے ایک ٹکڑا منہ میں ڈال لیا۔

"ارے صاحب یوں نہیں سب کھائیے"۔

"لو بھئی —— دعوت ہونے لگی۔ خیر ہرج ہی کیا ہے"۔ میں نے دو چار لبسکٹ بھائی کو دے کر خود سب صاف کر دیئے۔ پھر رومال سے منہ صاف کر کے بھائی کی انگلی پکڑے باہر نکل آئی۔

"اجی جناب! خریدیئے گا نہیں؟" وہ دو قدم میری طرف بڑھا۔

"خرید کر کیا کرنا ہے۔ لبسکٹ کھانا تھے سو تم نے کھلا دیئے"۔ میں نے بھنا کر کہا تاکہ کمبخت کو تنبیہ ہو جائے۔

"ہی، ہی۔ بھلا ہم آپ کو کیا کھلائیں گے، کبھی پھر آیئے تو کھائیے گا"۔ وہ نہ معلوم کیا سمجھتے ہوئے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

Scanned with CamScanner

ہم تو چلے تھے اسے تنبیہہ کرنے اور اس نے پھر دعوت بول دی۔ میں
اسے جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گئی چلتے چلتے بھائی کے ننھے منے پاؤں تھک
گئے تھے اور خالی تانگہ کوئی نظر ہی نہ پڑتا تھا۔ خدا خدا کر کے چوراہے پر
ایک تانگہ دکھائی دیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ سے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

"کہاں جانا ہے —؟"

"حضرت گنج!"

"ایک روپیہ ہو گا"

"ایک روپیہ؟"

"ہاں حضور کم نہ ہو گا۔ گھوڑے کو پیٹ بھر چنا بھی نہیں ملتا۔ مار ڈالا اس
مہنگائی نے"

"سب تم کھا جاتے ہو گے، پھر گھوڑے کو ملے کیسے"

"ارے بٹیا کی باتیں۔ تو بیٹھئے آپ"

"بٹیا —!" مجھے تانگے والے پر محبت آگئی اور بھائی کو بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئی
بے چارے نے مجھے بٹیا کہہ دیا۔ اگر یہ کچھ اور کہہ دیتا تو میں کیا کر لیتی —؟

ارے ہاں — وہ تو ان یکہ والوں۔ پان والوں، بسکٹ والوں اور بھی
تمام والوں کو حق ہے کہ چاہے کسی قسم کی بھی عورت راستہ چلتی ہو جو رشتہ چاہیں
جوڑ لیں۔ اس کے برعکس۔ بیچاری عورت یہ حرکت نہیں کر پاتی۔ اگر کوئی راستہ
چلتے ہیں اسے پسند آجائے تو چیخ پڑے۔ فرض کیجئے کہ کوئی خوبصورت سا مرد
راستہ چل رہا ہے۔ خوبصورت ننھی منی مونچھیں۔ سرخ سفید رنگ۔ مضبوط جسم

Scanned with CamScanner

اور بہترین سوٹ پہنے ہوئے۔ تو کوئی عورت یوں نہ چیخ پڑے گی کہ

"راجہ مونچھوں پر اتنا نہ اترایا کرو۔"

"بھئی اپنا ٹٹو ذرا تیز ہنکاؤ۔ یہ تو پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا ہے۔"

میں نے مریل گھوڑے کے رینگنے سے اکتا کر کہا۔ اور اس نے بیدردی سے گھوڑے پر چابک برسانی شروع کر دی۔

"ابے! دیکھ اس برقع والی کی صورت مناجان سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ ہائے کیسی البیلی ہے وہ نہ جانے اس کے کوٹھے سے کتنے واہ واکرتے نکل جاتے ہیں"

ایک گورے سے گیارہ بارہ سال کے لڑکے نے اپنے ساتھی سے کہا۔ جو عمر میں اس سے کچھ چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک للچائی سی نظر ڈالی۔

یا اللہ —— یہ صاحبزادے اس عمر میں مناجان سے واقف ہو گئے۔ ممکن ہے کہ مناجان کے دوستوں کی سگریٹ پان لا دیتے ہوں۔ یا پھر ممکن ہے۔ کہ مناجان سے آئندہ بہت سی امیدیں وابستہ کر کے اس کے پاؤں دبا دیتے ہوں یا پھر اللہ ہی جانے کیا کرتے ہوں —— ؟ میں ان کے لئے کچھ زیادہ نہ سوچ سکی اور وہ دونوں ایک گلی میں غائب ہو گئے۔

گھر پہنچی تو بھابی صاحبہ کا پتہ نہ تھا۔ کپڑا کرسی پر پھینک کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔

"اور آپ —— ؟ بھابی کے بھائی افروز میرے پلنگ پر لیٹے کچھ پڑھ رہے تھے۔ میں نے پلٹنا چاہا۔ تنہائی میں بڑے بھیانک لگتے تھے وہ۔

"کہاں گئی تھیں شہلا —— ؟" انہوں نے سوال کر دیا۔

Scanned with CamScanner

"بھابی کہاں ہے"؟ میں نے الٹا سوال کر دیا۔

"ہوں گی کہیں، اور یہ تمہاری صورت کیوں اتری ہوئی ہے"؟

"جی وہ بات یہ ہوئی ——" کرسی پر بیٹھ کر میں نے انہیں راستے کے تمام حالات بتا دیئے۔ اور پھر اپنی کوفت یاد کر کے رونا آ گیا۔

"افوہ ——" انہیں ہنسی آ گئی اور ہنسی کے بعد ہی محبت پھوٹ پڑی لگے اپنے مہکتے ہوئے رومال سے آنسو پونچھنے۔

"آپ ہنسے کیوں ——" مجھے غصہ آ گیا۔

"تمہاری حماقت پر"۔

"یعنی مجھے باہر نہ جانا چاہیئے تھا"؟ میں چڑ گئی۔

"اور نہیں تو کیا پگلی۔ بھلا اکیلے جانے کی کیا ضرورت تھی"۔

"ہوں — آخر آپ یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ نہ تمہارا اکیلے ٹھکانہ ہے نہ دوکیلے"۔ مجھے رونا آنے لگا۔

"تمہارا ٹھکانا تو بہت ہی حسین سا ہے"۔ ان کی آنکھیں کچھ عجیب سی ہو گئیں۔

"کہاں"؟

"یہاں"۔ انہوں نے اپنے بازوؤں کی طرف اشارہ کیا۔ اور میں کمرے سے بھاگی بے تحاشہ۔ بھابی اپنی انگلیوں سے مسل مسل کر کپڑا دیکھ رہی تھیں۔

"کیسا ہے یہ کپڑا"؟

Scanned with CamScanner

"بہت اچھا۔"

"اگر اسے کسی کے کفن کو دے دوں تو کیا رہے ہے؟"

"کیا بک رہی ہو؟" بھابی کی آنکھیں کچھ پھٹ سی گئیں۔ اور میں ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگی۔

اس دن میں نے تہیہ کر لیا کہ ایک بار نہیں ہزار بار جاؤں گی بازار چاہیے مجھے ایک دو کے نہیں دس بیس کے کفن سڑک پر پڑے ہیں۔ ❊

دیوانی

پھوپھی نیا شکار پھانس کر کسی قدر مطمئن معلوم ہو رہی تھیں۔ کئی ماہ بعد آج اُنھوں نے آئینے کے سامنے تن کر اپنے بنے سنورے سراپا کا ملاحظہ کیا۔ اور پھر غور سے اپنی بھتیجی کی طرف دیکھا۔ ایسی نظروں سے جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ کمبخت اس بار اگر تو نے میرے شکار پر جھپٹا مارا تو میں تیری بوٹیاں ہی نوچ ڈالوں گی ـــ گھر سے نکال دوں گی۔ پھر کوئی دو کوڑی کو نہ پوچھے گا ـــ کمینی! ہمارا ہی کھائے ہمیں پر چر کے لگائے۔

بھتیجی جو صوفے پر پڑی "چر کے" پڑھ رہی تھی کچھ چوکنی ہو کر کنکھیوں سے پھوپھی کو دیکھنے لگی۔ پھوپھی کو...... اس قدر بنا سنورا دیکھ کر اس کے ہونٹ مارے ہنسی کے پھڑپھڑانے لگے "بوڑھی گھوڑی لال لگام۔ کیسا سنگار کیا ہے۔ نہ جانے کس غریب کو کچھ دن تک نچانے کے لئے ـ میں تو اس سے مل کر

Scanned with CamScanner

رہوں گی۔ یہ ہمیشہ کی طرح اسی موقع پر مجھے گھر سے ٹرخا نہیں سکتیں۔ ان سے ملنے والوں کا مجھ سے ملنا ضروری ہے۔" یہ سوچتے ہوئے اس کے لبوں سے ایک ننھا منا قہقہہ نکل گیا۔ پھوپھی آئینے کے سامنے سے بل کھا کر پلٹیں۔

"یہ ہنسا کیوں جا رہا ہے ۔؟" پھوپھی نے ناک بھوں سکیڑ کر پوچھا۔ انہیں خیال آیا کہ ضرور انہیں ٹھاٹ کرتے دیکھ کر ہنسا گیا ہے۔

"پھوپھی یہ کتاب ہی ایسی ہے کمبخت۔" اسے کوئی بہانہ ملا ہی نہیں۔

"میں نے بھی تو پڑھی تھی۔ مگر ایک جگہ بھی ہنسی نہ آئی۔ رونی صورت ہے اس کی مصنفہ۔ اور تم کہتی ہو کہ کتاب ہی ایسی ہے۔" پھوپی اُسے مشکوک نظروں سے دیکھتی ہوئی پھر آئینے کی طرف مڑ گئیں۔ اور اب اس نے انہیں نظر بھر کر دیکھا۔ بازوؤں کا تھل تھل کرتا گوشت پوری آستین کی خوب چست بلاوز میں دبا ہوا تھا۔ اور ہلکی پھلکی اڑتی ہوئی نیلی ساری۔

"اُٹھ جاؤ اب رشو۔ نہا کر کپڑے تبدیل کرو۔ چار بج رہے ہیں اور چھ بجے تم کو مسز حیدر سے ملنے ان کے گھر جانا ہے۔" پھوپی نے اسے گھر سے بھگانے کا سامان کر دیا۔

"جی بہت اچھا۔" راشدہ سعادت مندی سے کتاب رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کون کمبخت جاتا ہے گھر سے۔" اس نے بھی اپنے جی میں سوچ لیا۔ اور کپڑے نکال کر غسلخانے میں چلی گئی۔ اور پھوپھی نوکروں پر مختلف قسم کے احکام صادر کرنے لگیں۔ یہ یہاں رکھو۔ وہ وہاں۔ اب تو راشدہ کو پورا پورا یقین ہو گیا۔ کہ ضرور پھوپی کسی کلب گھر یا سینما ہاؤس میں ملی ہیں اور اسے گھر آنے کی دعوت دی گئی ہے

وہ سوچنے لگی کہ جب پھوپھا مرے تھے تو پھوپی نے کیسی ہائے ویلا مچائی تھی اور کہا تھا کہ اولاد ہونا تو میری قسمت میں نہ تھا پر اب یہ یتیم رشو ہی میری سب کچھ ہو گی دادا میاں کے گھر سے بلا کر زبردستی مجھے اپنی بیٹی بنا رکھا تھا۔ کیسے لاڈ پیار تھے اور اب یہ حال کہ مجھے دیکھے سے ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ اُف توبہ! یہ وہی مہربان سی پھوپی تو ہیں جنھوں نے اپنی بھرپور جوانی کے دن میرے لاڈ اور عبادت میں گزارے تھے۔ سمجھتی تھیں کہ پھوپا کے ساتھ ساتھ جوانی اور جوانی کی اُمنگیں سب قبر میں دفن ہو گئیں۔ لیکن۔ لیکن اب اس ڈھلتی عمر میں نہ جانے کس طرح وہ جوانی اور امنگیں پھوپا کی قبر سے نکل بھاگیں —— یہاں تک کہ اب ٹانگ برابر چھوکروں کی بھی خیر نہیں —— اس دن شکیلہ نے کلب گھر میں کیسا بنایا تھا کہ "بھئی اب لڑکوں کو پردے بٹھا دو۔ ورنہ رشو کی پھوپی ضرور کسی نہ کسی کا انتخاب کرلیں گی —— بھئی قاعدہ سے تو اب رشو کی شادی ہونا چاہئیے" اس دن میں کتنی شرمندہ ہوئی تھی۔ بھلا پھوپی کو کیونکر سمجھاؤں کہ یہ سب باتیں ٹھیک نہیں۔ کبھی پھوپا کی روح آکر گلا نہ گھونٹ دے۔ تو پھر بس ——

راشدہ نے ٹب میں ایک غوطہ لگایا۔ اسے پھوپھی کی حالت پر ہنسی آرہی تھی۔ کیسی بولائی بولائی سی پھرتی ہیں بیچاری۔ وہ وجاہت، شمیم، جاوید اور خالد ان میں سے ایک بھی تو پھوپی کا نہ بنا۔ بلکہ سب کے سب اسی کی طرف ڈھل گئے وہ تو کہو خود اسی کو ان میں سے ایک بھی پسند نہ تھا۔ اسی لئے ٹھکرا دیا۔ ورنہ پھوپی سے پیچھا چھڑانے کی تو اسی کو سخت فکر ہو رہی تھی۔ جدھر جاتی غریب پھوپی کے کارن بنائی جاتی۔ اب ضدیا گئی تھی وہ بھی —— پہلے تو پھوپی کا شکار چھیننے کا اسے ذرا

بھی خیال نہ تھا لیکن انہوں نے خود ہی اس پر شبہ کر کر کے اسے اپنا دشمن بنا لیا تھا۔

"اب نہا بھی چکو رشو۔" پھوپی نے آواز دی۔

"بس آئی۔" رشو کپڑے پہن کر باہر نکلی۔

ہلکے ہلکے بادل چھا رہے تھے۔ پھوپی برآمدے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر لیٹی ہولے ہولے کچھ گنگنا رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ہلکے سرمئی رنگ کی ریشمیں ساری باندھی، چہرے پر پاؤڈر لگایا۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کی پالش کی۔ چھوٹے چھوٹے بے چین گھنگریالے بالوں کو ربن سے کسا اور پھوپی کے سامنے جا ڈٹی۔ اس کے سامنے وہ ایسی معلوم ہوئی جیسے چاند کے آگے مدھم تارا ۔۔۔ پھوپی اسے دیکھ کر کڑھیں اور وہ دل ہی دل میں مسکرائی۔ ویسے تو اسے ٹھاٹ باٹ سے نفرت تھی لیکن جب پھوپی کو بنا سنورا دیکھتی تو ایسے سنگار کرتی۔ کہ وہ بیچاری پھیکی پڑ کر رہ جاتیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پھوپی کے ہونے والے شکار اس کے فائر کئے بغیر اس کے قدموں پر آ پڑ جاتے۔ اب وہ چاہے انہیں بھون کر کھائے، چاہے کچا اڑائے یا زخمی کر کے چھوڑ دے۔

"اب تم کو جانا چاہئے۔" پھوپی کو اسے بھگانے کی جلدی پڑی تھی۔

"ارے پھوپی ابھی تو پانچ بجے ہیں۔ آپ نے چھ کا ٹائم دیا ہے۔" اُس نے کہا۔

وہ اس ٹینس میں تھی کہ کسی طرح یوں ہی وقت گزر جائے اور وہ کہیں نہ جائے

"خیر تم کو یہاں سے ساڑھے پانچ بجے چل دینا چاہئے۔" وہ کچھ بے چین ہو

Scanned with CamScanner

رہی تھیں۔

"جی ضرور!" وہ ایک کتاب لے کر دوسری آرام کرسی پر دراز ہو گئی۔ پھوپی اُٹھ کر کچھ مضطرب سی ٹہلنے لگیں اور ٹہلتے ٹہلتے کلائی پر بندھی ہوئی ننھی سی گھڑی کو دیکھتی جاتیں۔ ہلکے ہلکے بادل اب کچھ گہرے ہو چلے تھے۔

"اب جا بھی چکو رشو۔ کہیں پانی نہ برسنے لگے"۔

"جی! میں بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ پانی نہ برسنے لگے"۔ راشدہ نے دوسری کرسی اپنے قریب کھینچکر اس پر پاؤں رکھ دیئے۔ اس کے اس اطمینان سے پھوپی ایک بل کھا کر رہ گئیں۔ برآمدے کے چکر اب کچھ تیزی سے ہونے لگے۔ اور اسے جیسے نیند آنے لگی ہو۔ پہلے تو آنکھیں اُلٹانے پلٹانے لگی پھر کتاب ہاتھ سے گرا دی۔ بس آ گئی نیند۔ اور لگی زور زور سے سانس لینے۔ پھوپی تلملا کر رہ گئیں۔

"سو رہی ہے کمبخت یا موت کی نیند آ رہی ہے کیا مجال جو کہیں چلی جائے۔ اور جب وہ آ جائیں گے تو ٹیاں سی آنکھیں کھول کر ٹپر ٹپر باتیں بنانے لگے گی۔ کہاں ڈھکیل دوں اس منحوس کو۔ خدا تو اسے موت ہی دے دے۔ مچھاتی ہوئی لاش نکلے گھر سے"۔ پھوپی نے کچکچا کر اسے منہ ہی منہ میں کوسا۔ اور پھر گھڑی دیکھی تو چھ بج رہے تھے۔

"رشو اُٹھ! تجھے جانا نہیں مسز حیدر کے ہاں، وہ انتظار کر رہی ہوں گی"۔ پھوپی نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"اوں — آں — ہاں — مس — از — حیدر — نہ — نس — نیند"۔ رشو ہاتھ پاؤں پٹخ کر گلے سے خر خر کرنے لگی، جیسے بے خبر سو رہی ہو بے چاری

اور پھر پھوپی کی آنکھ بچا کر انہیں دیکھا۔ بری طرح بیتاب۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اسے ہنسی آنے لگی۔ لیکن ضبط کر گئی۔

"اچھا نہ جاؤ میرا کیا جاتا ہے"۔ وہ بے بسی سے کرسی پر پڑ گئی۔ رنّو زور زور سے خر خر۔ خوں خوں۔ سوں سوں۔ کئے جا رہی تھی۔

"بیگم صاب کوئی آپ سے ملنے آیا ہے"۔ نوکر نے آ کر اطلاع۔ اور پھوپی چھٹ دروازے کی طرف اُڑ گئیں۔ راشدہ نے اپنے گرد و پیش ایک نظر ڈالی اور پھر سوتی بن گئی۔

چند منٹ بعد پھوپی ایک بہت ہی حسین نوجوان کے ساتھ مسکراتی ہوئی برآمدے میں آ گئیں۔ بیچاری نے برآمدے ہی میں بٹھانے کا انتظام کیا تھا۔ لیکن راشدہ کی بھی دیدہ دلیری یہ جانتے ہوئے کہ کسی نئے آدمی کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ وہیں ٹھاٹ سے لیٹ کر سوتی بن گئی۔ پھوپی کا بس چلتا تو برآمدے میں نہ بٹھاتیں۔ تا کہ راشدہ پر نظرِ عنایت نہ ہو۔ لیکن گرمی تو ایسے غضب کی ہو رہی تھی۔ بھلا کمرے میں بیٹھنے والا کیا کہتا اپنے دل میں؟ بادل چھا رہے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور مجھے کمرے میں گھونٹا جا رہا ہے۔ کیسی بدمذاق عورت ہے؟ لو! پھوپی کا پہلا ہی اثر خراب پڑتا۔

"بڑا انتظار کرنا پڑا"۔ پھوپی نے کرسی میں دھنس کر ناز سے ایک وار کیا۔

"میں —— جی ذرا دیر ہو گئی"۔ وہ کچھ بوکھلا گئے۔ اور پھر جو نظر گھمائی تو راشدہ پر ٹھہر گئی۔ گو اُس کا منہ ساری کے پلے سے چھپا ہوا تھا۔ لیکن گورے ہاتھ پاؤں تو کھلے ہوئے تھے؟

Scanned with CamScanner

"موسم کتنا سہانا ہے۔" پھوپھی نے کھٹ سے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"جی ہاں۔" پھر وہ چوری چوری راشدہ کو دیکھنے لگے۔ اور اس نے بھی ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔

"اوں — اوں — سوں —" راشدہ نے جیسے نیند میں کسمسا کر پاؤں ٹیکے تو اس کی بھری بھری پنڈلیوں سے ساری ذرا اوپر سرک گئی۔ پھوپی کا دل چاہا کہ اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیں لیکن پھر یہ سوچ کر دل کو سمجھا لیا کہ فتنے کا سوتا رہنا ہی اچھا ہے۔

"اس وقت کہیں تفریح کو چلا جائے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟" پھوپی نے راشدہ کو سوتا چھوڑ کر بھاگ جانے کی ٹھان لی۔

"جی ہاں ضرور۔ مجھے آپ کے ساتھ چلنے میں بڑی مسرت ہوگی —" انہوں نے کہا اور پھوپی کھل اٹھیں۔ ادھر راشدہ نے سوچ لیا کہ جب یہ لوگ جانے لگیں گے تو ایک دم کسمسا کر جاگ پڑے گی۔ چاہے اس کسمسانے میں کرسی سے گرنا ہی کیوں نہ پڑے۔

"کیوں نہ سینما چلا جائے؟" انہوں نے ذرا رنگین سا مشورہ دیا۔

"ضرور — لیکن وقت تو بہت کم رہ گیا ہے۔ آپ جلدی سے چائے پی لیں؟" پھوپی نے کہا اور ملازم کو اشارہ کیا۔ بس ذرا کے ذرا میں صحن کے وسط میں پڑی ہوئی سنگ مرمر کی میز پر چائے کا سامان سج گیا۔ پھوپی اور وہ وہاں ڈٹ گئے۔ پیالیوں میں چائے انڈیلی جانے لگی — بیچاری راشدہ کو کسی نے جھوٹوں

اُٹھایا بھی نہیں۔ بھلا وہ خود سے اُٹھ بھی کیسے سکتی تھی۔ سو جو رہی تھی غریب اُس نے کنکھیوں سے ان لوگوں کو دیکھنا شروع کیا۔ وہ دونوں ہنس ہنس کر چائے چڑھا رہے تھے۔ بیچاری راشدہ کیسی ترس رہی تھی آیا، پیالی کے لئے ـــــ چائے پینے کے بعد وہ لوگ۔ جانے کے لئے کھڑے ہوئے اور راشدہ ہڑ بڑا کر جاگ گئی۔ موقع ہاتھ سے نکلا ہی چاہتا تھا۔ وہ جھومتی جھامتی ان کے سروں پر جا دھمکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ جیسے کسی نے اسے کچی نیند سے اٹھا کر کھڑا کر دیا ہے۔ راشدہ کو دیکھ کر پھوپی پر بجلی سی گر پڑی۔ اور وہ خوش تھے۔

"آپ کی تعریف؟" انہوں نے پھوپی کی طرف بڑی مشکل سے نظریں موڑیں

"یہ میری بھتیجی ہے راشدہ ـــ امسال ہائی سکول کا امتحان دے گی۔ اور راشدہ! یہ ہیں مسٹر نسیم یہاں کے رئیس اعظم فہیم صاحب کے بیٹے" پھوپی نے پہلے تو راشدہ کی ڈھلکی ہوئی ساری کو گھورا پھر تعارف کرا ہی دیا۔

نسیم نے ہاتھ بڑھایا لیکن راشدہ نے دور ہی سے سلام کر کے چائے پینا شروع کر دی۔ پھوپی کچھ کڑھ رہی تھیں۔ اور وہ سعادت مندی سے سر جھکائے چائے پی رہی تھی۔

"شاید آپ نے میرے آنے کی اطلاع انہیں نہیں دی تھی؟" نسیم نے پھوپی سے پوچھا۔

"ایں ـــ ہاں ـــ جی ـــ یہ تو بہت سوتی ہے۔ کب کی پڑی سو رہی ہے اطلاع کیسے دیتی" پھوپی بہت بوکھلا گئیں۔ اور راشدہ نے مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی۔

Scanned with CamScanner

"تو پھر چلنا چاہیئے اب سینما ؟" نسیم نے پھر رنگین مشورے کی یاد دلائی۔
"اب تو وقت نکل گیا۔" پھوپی نے پھیکے پن سے کہا اور کرسی کی پشت پر سر ٹیک دیا۔
"ابھی تو پکچر شروع ہونے میں بیس منٹ باقی ہیں۔ کار پر زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔" نسیم نے گھڑی دیکھ کر کہا۔
"لیکن بھئی نہ جانے کیوں چائے پینے کے بعد سے سر میں درد ہونے لگا۔ کیوں نہ آج کا جانا ملتوی کر دیا جائے۔" پھوپی نے بہانہ بنا کر اور کرب سے پہلو بدل کر ایک لمبی سانس چھوڑ دی۔ نسیم پھر اصرار نہ کر سکے۔ ورنہ انہیں رنج تو بہت ہوا اس وقت نہ جانے کا۔ کیا مزا آتا۔ راشدہ کے پہلو والی سیٹ گھیرتے۔ کبھی کبھی پہلو بدلنے سے دونوں ایک دوسرے سے چھو جاتے۔
راشدہ چائے پینے کے بعد سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ نسیم نے چھیڑ چھیڑ کر باتیں شروع کیں لیکن وہ بس ہوں ہاں سے جواب دیتی رہی۔ وہ جانتی جو تھی کہ بے نیازی عورت کا وہ حربہ ہے کہ مرد تلملا کر رہ جائے۔ پٹر پٹر باتیں کرنے میں بھلا یہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے؟ راشدہ کچھ دیر بعد یہ اٹھا وہ دھرنے لگی۔
"آپ کی بھتیجی کو میرا آنا کچھ اچھا نہیں لگا۔" نسیم نے دبی آواز میں کہا۔
"جی — جی ذرا وہ بہت کم کسی سے ملتی ہے۔ اور پھر ہے بھی سدا کی مغرور" پھوپی نے فوراً اس کی بُرائی کر دی اور پھر دونوں ہنس ہنس کر جانے کیا کیا باتیں کرنے لگے۔ پھوپی نسیم کو اپنے لئے سیدھا کر رہی تھیں۔ اور نسیم پھوپی کو

ہموار کر رہا تھا راشدہ کے لئے۔

"تو پھر کل آپ ملیں گی نا جگت ٹاکیز میں ساڑھے سات بجے"؟

"ہاں ضرور"

"اور راشدہ صاحبہ کو بھی ضرور لائیے گا"

"اچھا" پھوپی نے ناگواری سی محسوس کرتے ہوئے کہدیا۔ راشدہ کے کان میں جو مطلب کی باتیں پڑیں تو فوراً رخصت کرنے کے بہانے سے آگئی۔

"تو پھر کل آپ بھی اپنی پھوپی کے ساتھ آئیں گی نا"؟ نسیم نے ٹھیٹ نیاز مندانہ صورت بنائی۔

"کہاں"؟ راشدہ بالکل بھولی بن گئی۔

"جگت ٹاکیز میں"

"اگر پھوپی جائیں گی تو میں بھی ساتھ ہو لوں گی" راشدہ نے اس طرح کہا۔ جیسے وہ نسیم پر بڑا احسان کر رہی ہو۔

"شکریہ"! نسیم نے راشدہ کے سامنے بالکل بچھتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

"مجھے آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ بہت زیادہ" چلتے چلتے نسیم نے ایک اور انکشاف کیا۔

"مجھے بھی مسرت ہوئی" راشدہ نے نسیم کی مسرت کا بدلہ فوراً ہی چکا دیا۔ اور پھر جیسے ہی وہ گئے پھوپی راشدہ پر برس پڑیں۔

"بدتمیز — نالائق۔ تم مسز خیدر سے ملنے کیوں نہ گئیں"؟

"جی پھوپی! نہ معلوم نیند کمبخت کہاں سے آگئی، کل ان سے معافی مانگ لونگی جاکر۔" راشدہ نے بھولے پن سے منہ لٹکا دیا۔

"تم ہمیشہ یہی کرتی ہو۔ میری ذلت کرا کے تم کو مسرت ہوتی ہے۔" پھوپی تلملا کر بولیں۔

"جی نہیں تو۔" راشدہ منہ بسورنے لگی تو پھوپی کو غصہ ضبط کرتے بنی۔

"کل جاکر معافی ضرور مانگنا۔"

"بہت اچھا۔" راشدہ نے سعادت مندی سے سر جھکا دیا۔

"مانگی نہ ہو مسز حیدر سے معافی۔" راشدہ کو غصہ آرہا تھا۔ یکی دوست تھیں وہ پھوپی کی جب وہ کسی صاحبزادے کو اپنے گھر مدعو کرتیں تو مسز حیدر ہمیشہ "رشو پیاری" کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے دیتیں۔ اس طرح راشدہ کے ہاتھ سے کتنے ہی موقعے نکل گئے لیکن خدا بڑا مہربان تھا اس پر۔ پھوپی کے صاحبزادوں سے اس کی کسی نہ کسی طرح مڈبھیڑ ہو ہی جاتی۔

دوسرے دن راشدہ صبح ہی مسز حیدر سے معافی مانگنے کا کام انجام دے آئی۔ اور پھر تمام دن سائے کی طرح پھوپی کے ساتھ رہی۔ سات بجے پھوپی سینما جانے کے لئے تیار ہو رہی تھیں۔ راشدہ نے بھی ان کا ساتھ دیا لیکن چلتے وقت وہ منہ دیکھتی رہ گئی۔ کیونکہ پھوپی نے اسے جھوٹوں بھی نہ پوچھا۔ آخر راشدہ سے ضبط نہ ہوا۔ وہ ان کے پیچھے لپکی۔ پھوپی پھنکارتی ہوئی کھڑی ہوگئیں۔

"میں بھی چلوں پھوپی؟"

"کہاں؟"

Scanned with CamScanner

"جگت ٹاکیز، آپ نے کل مسٹر نسیم سے وعدہ کیا تھا نا؟"

"اوہ ــــ وہ، میں نے ان سے فون پر کہہ دیا کہ نہ آسکوں گی۔" پھوپی نے فوراً بہانہ بٹ دیا۔

"تو پھر اب آپ ــــ" راشدہ سے کچھ کہتے نہ بن پڑی۔

"کیا کہنا ہے۔ جلدی کہو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔" ان کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"میں اپنی ایک دوست کے ہاں چلی جاؤں؟"

"جاؤ۔" پھوپی پیچھا چھڑا کر لمبے لمبے قدم مارتی ایک ٹھیری ہوئی ٹیکسی کی طرف بڑھ گئیں اور راشدہ گھر میں آگئی۔ اسے پھوپی کے بہانے پر ہنسی آرہی تھی۔ ویسے تو خیر وہ یقین کر لیتی لیکن اس نے دن میں ایک بار بھی فون کے پاس جاتے نہ دیکھا تھا صبح جب وہ گئی تھی۔ تو پھوپی سو رہی تھیں اور جب واپس آئی تب بھی۔ وہ سوچنے لگی۔ کہ اب کیا کیا جائے جو وہ جگت ٹاکیز پہنچ کر پھوپی پر بجلی بھی گرا دے اور اس پر کوئی بات بھی نہ آئے۔ چند منٹ سوچنے کے بعد وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ وقت بالکل نہ رہا تھا۔ اس نے جھٹ ٹیکسی کر لی اور اپنی سہیلی رقیہ کو جا پکڑا جو اپنی کوٹھی کے سامنے والی لمبی چوڑی سڑک پر لڑھک رہی تھی۔

"اری ــــ بھلا یہاں کیا کر رہی ہے، چل تو میرے ساتھ۔"

"ارے بھئی کہاں لے جاؤ گی مجھے؟" رقیہ گھبرا گئی۔ راشدہ کی سانس جو چڑھی ہوئی تھی۔ "جگت ٹاکیز، خدا کی قسم بڑا اچھا فلم ہے۔"

"لیکن ــــ لیکن۔"

لیکن ویکن کیا۔ بس تم بیٹھ جاؤ ٹیکسی میں۔ ورنہ اکیلے مزا نہ آئے گا۔" راشدہ

Scanned with CamScanner

نے رقیہ کو گھسیٹ کر ٹیکسی میں ٹھونس دیا۔ موٹی بھینس رقیہ پوری سیٹ پر چھا گئی۔ کالی کلوٹی۔ راشدہ تو اس کے سائے سے بھی گھبراتی تھی۔ لیکن وقت پڑے پر بیچاری کو اس کے پاس آنا پڑا۔ ورنہ اور بھی تو تھیں سلمیٰ۔ ثریا۔ طلعت وغیرہ۔ سب کی سب بڑی حسین اور با مذاق لیکن اسی حد تک۔ خطرناک بھی۔ تبھی راشدہ کو رقیہ کا ساتھ منظور ہوا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ خوبصورت سہیلیوں کو ساتھ لے کر کسی مرد سے ملنا کہاں تک جائز ہوتا ہے۔

ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی جگت ٹاکیز پہنچ گئی۔ پہلے راشدہ اتری اور پھر رقیہ کو نیچے گھسیٹا ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے راشدہ نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ پھوپی اور نسیم ٹکٹ گھر کے پاس کھڑے تھے۔ راشدہ وہیں کھڑے ہو کر رقیہ سے ادھر ادھر کی ہانکنے لگی تاکہ دونوں ہال میں چلے جائیں۔ پھر وہ بھی ٹکٹ لے لیں۔ جب پھوپی اور نسیم اندر چلے گئے۔ تو اس نے بھی دوڑ کر گیلری کے ٹکٹ لے لئے اور رقیہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر داخل ہو گئی۔ فلم شروع ہو چکا تھا۔ راشدہ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھانے لگی۔ اسے گیلری کے ایک کونے میں پھوپی کی ساری چمکتی نظر آئی اور وہ اُسی طرف بڑھی لیکن رقیہ کا یہ عالم کہ جو بھی خالی سیٹ نظر آتی ہانپتی ہوئی اسی پر ٹک جاتی۔ راشدہ بیچاری کو پھر زور لگانا پڑتا۔ بڑی مشکل سے وہ ان دونوں کے قریب پہنچی۔ ساری کا پلّو ذرا چہرے پر سے کھینچا اور نسیم کے پہلو والی سیٹ پر دبک گئی۔ اور اپنے پہلو والی سیٹ پر رقیہ کو ڈھکیل دیا۔

رقیہ تو راشدہ کے پیسوں کا صحیح مصرف کرنے میں کھوئی ہوئی تھی یعنی خوبصورت ہیرو کے دیکھنے کی دھن میں پلک تک نہ جھپکا رہی تھی لیکن راشدہ پھوپی اور

نسیم کی کُھسر پُھسر اور حرکات و سکنات پر اپنے کان اور آنکھیں لگائے ہوئے تھی۔
اور جب انٹرول ہوا تو نسیم اُچھل پڑے ___

"اوہ ___ آپ کہاں ___؟"

پھوپی نے بھی دیکھا اور جیسے ان پر بجلی گر پڑی۔ راشدہ چپ تھی۔

"آپ کیسے آ گئیں؟ آپ کی پھوپی نے تو کہا تھا۔ کہ آپ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" نسیم نے پوچھا۔ اور پھوپی کا دل چاہا کہ منہ کالا کر جائیں یا پھر راشدہ کو کھا جائیں۔

"جی! واقعی میری طبیعت ذرا خراب تو ہو رہی تھی۔ لیکن یہ میری دوست آئیں اور زبردستی مجھے گھسیٹ لائیں۔ ورنہ میرا تو آنے کا قطعی ارادہ نہ تھا۔" راشدہ نے پھوپی کی لاج رکھ لی۔ اور پھر بات ٹالنے کے لئے رقیہ کا تعارف کرانے لگی۔

"آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔" رقیہ نے اپنے تھل تھل چہرے پر ذرا ناز پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی۔" نسیم نے بھی رسمِ دُنیا ادا کر دی۔

"جی ۔ وہ تو کہئے کہ بھلا آپ سے کیوں شرف ملاقات حاصل ہوتا۔ آج یہ رشو آئیں میرے ہاں دوڑی ہوئی اور ___" راشدہ نے رقیہ کے ایک چٹکی لی اور وہ ذرا گڑبڑائی۔

"اور اپنے ساتھ زبردستی کھینچ لائیں۔" رقیہ نے چٹکی کے بعد ایک جھرجھری لے کر پھوپی اور راشدہ دونوں ہی کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ نسیم مسکرائے۔ راشدہ کی نظریں

جھکیں، پھوپی نے منہ پھیرا۔ جیسے دنیا سے بیزار ہو گئی ہوں۔ اور رقیہ اپنی املی کی چیاں جیسی بیوقوف آنکھوں سے سب کو دیکھنے لگی۔

"چائے پئیں گی آپ لوگ؟" نسیم نے چائے سے سب کی شرمندگی کو دھونا چاہا۔ مگر وہاں تو سب کو چپکی لگی ہوئی تھی۔ جواب کون دیتا؟

نسیم نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ ادھر فلم شروع ہوئی۔ تو سب کی جان میں جان آئی۔ اندھیرے میں جھکی ہوئی آنکھیں اٹھیں۔ چائے آئی اور نسیم نے سب سے پہلے پھوپی کو پیش کی اور پھر رقیہ کو آخر میں راشدہ کو —— پیالی دیتے ہوئے نسیم کی انگلیاں راشدہ کی انگلیوں میں پھنس کر رہ گئیں۔ اور راشدہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اس سے پہلے کسی سے ملنے کی اتنی جدوجہد نہ کی تھی۔ نسیم کے کارن اس نے پھوپی کی جھڑکیاں سہیں اور رقیہ جیسی بھینس پر پیسے خرچ کئے —— فلم ختم ہوا۔ نسیم پھر ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ رقیہ نے اپنے گھر کی راہ لی اور راشدہ پھوپی کے ساتھ اپنے گھر آ گئی۔ راستے بھر اس نے یہی سوچا تھا کہ جانے پھوپی کیا درگت بنائیں گی۔ لیکن انہوں نے ایک لفظ نہ کہا۔ ہاں رات کو دیر تک وہ ناک چھینکتی رہیں۔ جانے انہیں زکام ہو گیا تھا یا رونا آ رہا تھا، کچھ راشدہ کی سمجھ میں نہ آیا۔

محبت کی پینگیں خوب خوب بڑھیں۔ پہلے تو پھوپی نے اپنے پر کاٹ کرنا چاہی لیکن پھر جانے کیا سوچ کر راضی برضائے بھتیجی ہو گئیں۔ آخر اس رومان کا خاتمہ شادی پر ہو گیا۔ پھوپی پیش پیش تھیں لیکن حال یہ کہ دونوں کی صورتوں سے بیزار۔ راشدہ ان کی بھتیجی تھی۔ یا بیرن۔ چلو اچھا ہی ہوا کہ راہ کا روڑا ایک طرف

ہوگیا۔ اور پھوپی کو بھی کچھ سکون ہوگیا۔

کچھ دن بعد راشدہ نے سنا کہ پھوپی نے بھی اپنی شادی رچا ڈالی۔ ایک غریب نوعمر لڑکے کے ساتھ۔ اور اب وہ اپنے شوہر نامدار کی دیرینہ تمنا یعنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرانے میں کھوئی ہوئی ہیں۔ راشدہ کا دل چاہا کہ اپنے معصوم پھوپا جان سے ملے۔ لیکن پھوپی نے تو اس پر عمر بھر کے لئے اپنے گھر کے دروازے بند کردیئے تھے' اسی لئے ہمت نہ پڑی کہ دیواریں پھاندے۔ ایک دن ایک پارٹی میں پھوپی اور ان کے شوہر سے راشدہ کی مڈبھیڑ ہوگئی لیکن بات چیت نہ ہوئی۔ پھوپی کے "وہ" تھے واقعی خاصے خوبصورت' لیکن بے حد دُبلے اور زرد ہو رہے تھے۔ چہرے سے ایسا معلوم ہوتا کہ دنیا سے بیزار ہیں ——

راشدہ نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پھوپی سائے کی طرح ان کے ساتھ تھیں۔ اُفوہ! بوڑھی بیوی' چھوکرے شوہر کو کس قدر چاہتی ہے بالکل اپنے بچّوں کی طرح دیکھ بھال کرتی ہے۔ لڑکوں کی صحبت میں زیادہ نہ بیٹھنے پائے لڑکیوں کی طرف نظر نہ اُٹھائے' سرِ شام گھر پر حاضر رہے ورنہ باہر "جوجو ہوّا" کاٹ لے گا۔ غرض ہر نیک و بد سمجھاتی رہتی ہے۔ اور شوہر ان چونچلوں پر بھی سوکھتا ہی جاتا ہے۔ اپنا رنگ ہلدی سے ملاتا جاتا ہے بالکل اس لڑکی کی طرح جس کی ماں پچیس تیس سال کی عمر میں بھی اسے بچہ کہکر شادی کی فکر نہ کرے۔ کئی سال گزر گئے۔

ایک دن راشدہ نے سنا کہ پھوپی کے "وہ" چپکے سے لڑائی پر نام لکھوا کر چلے گئے اور پھوپی چند ماہ سوگ منانے کے بعد اب پھر تنگ بلاؤزوں اور اُڑتی ہوئی ساڑیوں کی مدد سے کلب گھروں' سینما ہاؤسوں اور پارٹیوں میں دیوانہ وار کچھ تلاش کرتی پھر رہی ہیں ؎

Scanned with CamScanner

مکھّی

"تم چاہتی ہو کہ میں آنکھوں دیکھے مکھی نگل لوں۔ مجھ سے یہ نہ ہو گا۔ سمجھیں تم۔"
اس نے بپھر کر کہا۔ اور اسکے جھکے ہوئے بازو ایک دم تن گئے۔ کتنی دیر سے وہ چپکا
سر جھکائے ماں کی باتیں سن رہا تھا۔ لالچ دینے والی میٹھی میٹھی باتیں "دیکھ۔ نہیں
نہ کر دیجیو۔ کل تیرا نکاح ہے۔ دولت کی بھر مار ہو جائے گی۔ کل ہم سب کے دلدر
دُور ہو جائیں گے۔ اور میرے لال تو تو موٹر پر صاحب بہادر بنا پوں پوں کرتا پھریگا
ہاں ـــ اور نہیں تو کیا ـــ" ایسی ہی پچاسوں باتیں۔ مگر وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ ان میٹھی
میٹھی زندگی بنانے والی باتوں میں زہر بھرا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ زندگی ختم
کر دینے والا زہر۔

"تُو تو بولا یا ہوا ہے لڑکے ہمیں بھیک منگوا دیگا۔ آئی ہوئی دولت کو ٹھوکر مار
کر ہمیں تباہ کر دے گا۔" اس کے انکار پر وہ اسے حیرت سے دیکھ کر چیخ

پڑی اور پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنا پتلے گوشت سے جھولتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ اور جان کر کپکپانے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ بیٹے سے اقرار کرانے کے لئے اس کی یہ ترکیب کارگر ہو گی۔ اس نے اکثر اپنے بیٹے سے ایسے بہت سے کام کرا لئے تھے۔ جو وہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر کپکپاتا ہاتھ ہر بار اس کے سر پر چھا کر اسکے اچھا برا سمجھنے والے دماغ کو اپنی انگلیوں میں دبوچ لیا کرتا اور وہ جیسے مجبور ہو جایا کرتا۔ "تم ۔ تم ۔" تنے ہوئے بازو جھک گئے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کپکپاتا ہاتھ ۔۔۔ آنسو اور قریب بیٹھی ہوئی جوان بہنوں کی ملتجی نظروں نے اس کی زبان پکڑ لی۔ کب سے اس کی بہنیں اپنی شادیوں کے خواب دیکھتے دیکھتے اب مایوس ہو چلی تھیں۔ بھلا غریب کی لڑکی کو کوئی اچھا کھاتا پیتا گھرانا کیوں قبول کرنے لگا ۔۔۔ ؟ اور اب جبکہ بھائی کے قدموں پر گرتی ہوئی دولت نے ان کی مایوسیوں کو امید سے تبدیل کر دیا تھا تو بھائی ختم کر دینے پر تلا ہوا تھا۔ پھر اس کی بہنیں کیوں نہ بے شرمی لا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے التجا کرنے لگتیں۔ ان کی جوانی کا گلاب تو مرجھایا جا رہا تھا۔ وہ ذرا دیر تک ماں کے آنسو اور بہنوں کی چیختی ہوئی ملتجی نظریں دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر اپنے کوٹھری جیسے کمرے میں چلا گیا۔ مجبور۔ لاچار۔ کچھ تھکا تھکا سا۔ وہ پلنگ پر چت لیٹ کر زور زور سے پاؤں ہلانے لگا۔ جیسے اس کی مجبوری۔ لاچاری۔ اضطراب بنکر پیر دل میں اتر آئی ہوں ۔۔۔

خان بہادر کی لڑکی کو اس نے بیسیوں بار دیکھا تھا۔ بازار میں کسی شاندار دوکان کے سامنے کچھ نہ کچھ خریدتے ہوئے ۔۔۔ پکچر ہاؤس میں داخل ہوتے ہوئے۔ کوٹھی کے دالان میں ٹہلتے ہوئے۔ کسی سہیلی سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے۔

ہر ہر طرح دیکھنے کے بعد بھی وہ اسے ایک بے ہنگم جانور سے زیادہ کچھ نہ نظر پڑی۔ بے ڈھب لمبے چوڑے جسم پر چھوٹا سا کالا چہرہ کسی مخصوص اشارے کی طرح ایک آنکھ ذرا سی دبی ہوئی۔ ناک پھلورا۔ گال چپاتی اور چہرے پر اتنے چیچک کے داغ کہ انہیں پُر کرنے کے لئے پاؤ بھر قیمہ بھی ناکافی ہو اور اسی سے اس کی ماں شادی کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ لیکن وہ یہی کہتا۔ بھلا کوئی زندگی میں آنکھوں دیکھے مکھی کیسے نگل لوں؟ بس اس کا یہی کہنا تو ستم تھا۔ آخر نواب خان بہادر اس کے رشتے کے ماموں لگتے تھے۔ اور اپنی لڑکی کے ساتھ اسے بے انتہا دولت بھی دے رہے تھے۔ پھر ان کی لڑکی کو مکھی کہنا کتنی بری بات تھی؟ ہر بھلا آدمی سمجھ سکتا ہے کہ مکھی گندی ضرور ہوتی ہے۔ مگر جب گھی کے پیپے میں گر جائے تو بہت قیمتی ہو جاتی ہے۔ پھر اگر کوئی یہ کہے کہ ہم اس کال کے زمانے میں تم کو ایک پیپا گھی دیں گے لیکن دوست! اس میں پڑی ہوئی مکھی بھی کھانا ہوگی۔ تو کیا برا ہے؟ جو نہ کھانے پر راضی ہو وہ یقیناً ہر سمجھ دار انسان کی نظر میں بیوقوف ہوگا۔ پرلے درجے کا۔ اور تو سب خیر کر لیں انکار مگر ایک کلرک کے لئے ایسا انکار قطعی بے وقوفی ہے وہ تو اس زمانے میں گھی کی جتنی زیادہ قدر کرے کم ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں یہی باتیں نہ آتی تھیں۔ دس دن ہوئے جب اس کی ماں نے یہ شادی کی بات چھیڑی تھی اور ان دس دنوں میں اس نے محسوس کیا کہ خان بہادر کی لڑکی کے خیال سے ہی وہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے بار سے جھکے ہوئے بازو اب زیادہ جھک گئے ہیں۔ رنگ پہلے کی نسبت بہت زرد ہو گیا ہے۔ آنکھیں حلقوں میں دھنستی چلی جا رہی ہیں۔ اس قدر

Scanned with CamScanner

سرعت سے کہ اسے اپنی آنکھوں کے گم ہو جانے کا خدشہ ہونا جا رہا تھا۔ کتنا خوبصورت تھا وہ جب تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ کالج کے تمام طلبا میں اس کے بازو اور سینہ سب سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ اور صورت وہ بھی تو کیسی من موہنے والی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی حسین اور امیر کلاس فیلو فاطمہ اس کے سینے پر جان دے دینے کی متمنی رہا کرتی۔ وہ ہمیشہ اس کے پاس والی کرسی پر بیٹھتی اور جب لیکچر ہو رہا ہوتا تو ادھر توجہ دینے کے بجائے کنکھیوں سے اس کے بھرے بھرے بازو اور چوڑے سینے کو تکا کرتی۔ نہ جانے کتنی بار اس کا دل چاہا تھا کہ بس دم بھر کو وہ اس کے سینے سے لگ کر بڑی عجیب سی دنیا میں پہنچ جائے لیکن موقع ہی نہ ملتا۔ مگر ایک دن اس کے سینے سے لگ جانے کی تمنا نے کمال ہی کر دیا۔ ہوا یہ کہ جب چھٹی ہو چکی تھی اور تمام لڑکیاں لڑکے بھاگم بھاگ میں پڑے ہوئے تھے فاطمہ جان بوجھ کر اس سے ٹکر کر گر پڑی اور گرتے ہی گھٹ سے بے ہوش بن گئی۔ اس بیچارے نے جلدی سے اسے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ فاطمہ نے اپنا سر ڈھلکا کر اس کے سینے سے لگا دیا۔ جانے وہ اس کے سینے سے لگی کس دنیا کی سیر کر رہی ہو گی۔ کہ وہ گھبرا کر چیخ پڑا ارے فاطمہ بیہوش ہو گئیں۔ تمام لڑکیاں لڑکے پلٹ پڑے۔ فوراً ہی اسپتال لے جانے کا انتظام ہونے لگا۔ مگر تھی فاطمہ بڑی ڈرپوک کھٹ سے ہوش میں آ گئی۔ اپنے ہاتھ کی تو بات ہی تھی۔ ورنہ کیسا بھانڈا پھوٹتا جب ڈاکٹر خوب دیکھ بھال کر کہتا۔ یہ تو کسی طرف سے بے ہوش نہیں معلوم ہوتیں۔ اگر واقعی ڈاکٹر ہوتا تو ——— ورنہ کب بات کھلتی۔ لیکن وہ تو بزدل تھی۔ بڑے آدمی کی بیٹی

ہوتے ہوئے ــــ جیسے سارے بڑے آدمی بزدل ہی تو ہوتے ہیں۔ نالائق نے نام بد نام کیا بڑے آدمیوں کا۔

اس واقعے کے بعد فاطمہ نے ذرا ہمت کر ڈالی۔ اس سے صاف صاف محبت کا اظہار کر دیا۔ اور سب کی نظروں سے بچا بچا کر جوانی کے ترکش سے داؤں کے تیر چلانے لگی۔ لیکن وہ ہر تیر بڑے مزے سے بچا لے جاتا۔ ایک بھی نشانے پر نہ پڑنے دیتا۔ دراصل اس کے دھیان میں یہ بات جو بیٹھی ہوئی تھی کہ امیر کی چھوکری کبھی غریب سے محبت نہیں کر سکتی۔ وہ صرف اس کی جوانی اور حسن سے کھیلتی ہے ایک وقت تک پھر کتے کی طرح دھتکار دیتی ہے۔ بیچاری فاطمہ نے جو اپنے تیر خالی جاتے دیکھے تو پھر دولت سے اسے رام کرنا چاہا لیکن وہ اور بھی اس سے دور بھاگنے لگا۔ اسے جیسے یقین ہو گیا کہ فاطمہ چند سکے تھما کر اس کی مٹی پلید کرنا چاہتی ہے۔ غریب چھوکریوں کی طرح لیکن فاطمہ کو اس کے دور بھاگنے سے مایوسی نہ ہوئی وہ اس وقت تک اسے اپنا بنانے کی کوشش کرتی رہی جب تک کہ اس نے یہ نہ دیکھ لیا کہ اپنی کلاس فیلو غریب مگر حسین طاہرہ پر نثار ہوتا پھر رہا ہے۔ پھر تو فاطمہ کی سمجھ میں بھی آگیا کہ دراصل وہ تھا بھی نہیں اس کے قابل۔ غلاظت کا کیڑا غلاظت میں ہی رہنا پسند کرتا ہے۔ پھر بھلا وہ فاطمہ کو کیسے پسند کرتا؟ وہ بھی اپنی ٹکر کے ایک امیر لڑکے سے دل بہلانے لگی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ محبت کی ناکامی کے بعد کچھ دن بھی خانۂ دل کا خالی رکھنا بڑے جگرے کا کام ہے۔ فاطمہ نے دل بہلاتے بہلاتے ایک دن اس سے شادی کر لی۔ مگر اب ــــ

اب جب سے اس کی شادی کی بات چھڑی تھی اسے کبھی کبھی وہی فاطمہ

بری طرح یاد آجایا کرتی۔ صرف چند لمحوں کے لئے۔ اس وقت نہ سوچا تھا کہ اگر فاطمہ کی محبّت کو "معراج" پر پہنچا کے اس کو مجبور کرتے ہوئے شادی کر لیتا تو آج سبھی کچھ تو ملتا۔ دولت، عزت، حسن۔ لیکن اس نے تو اسے جان بوجھ کر ٹھوکر ماردی، اپنے حساب امیروں کو منہ چڑا دیا، ارے جاؤ بھی۔ ہم تم جیبوں کو خاطر میں نہیں لاتے جو کبھی اپنی امارت کا رعب گانٹھو۔ کچھ پتہ بھی ہے: "ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے"۔ کمبخت نے یہ نہ سوچا کہ زمانہ خاک نشینوں کی ٹھوکریں نہیں، زمانے کی ٹھوکریں میں خاک نشین بستے ہیں۔ پگلا ___

بی۔ اے کرنے کے بعد جو اس نے سمجھا تھا کہ بس اب ٹھاٹ دار ملازمت اس کے منہ کا نوالہ ہے جو ذرا میں ہڑپ کر جائے گا۔ اماں باوا نے اسے اپنی بچی کھچی پونجی سے پیٹ کاٹ کاٹ کر جو پڑھایا ہے تو ساری کسر عیش دے کر پوری کر دے گا۔ سو عیش دینا تو بڑی بات، سب کے پیٹ بھرنے کا سامان بھی ڈھنگ سے نہ کر سکا۔ ملازمت ملی پچاس روپلے کی۔ خلاف امید اسے ایسی ملازمت ملنے سے دھکا تو بڑا لگا۔ لیکن پھر اتنے ہی روپوں پر قانع ہو گیا۔ ہندوستان کے ہزاروں نوجوانوں کی طرح، جو دوران تعلیم میں جانے کیا کیا آس لگا لیا کرتے ہیں اور آس ٹوٹنے پر قانع ہو جاتے ہیں۔ چلو جی پیٹ تو بھرتا رہے گا۔ دال دلئے سے۔ کسی کے آگے ہاتھ تو نہ پھیلانا پڑے گا جیسے نوکری کرنا ہاتھ پھیلانے سے اچھا ہے۔ تو خیر اس نے بھی یہی کچھ سوچ کر قناعت برتی تھی اور کسی قدر خوش بھی تھا۔ لیکن آئے دن گھریلو مشکلات کا سامنا۔ چار عدد جوان بہنوں کی شادی کی فکر۔ چار معصوم بھائیوں کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ ان کے مستقبل کا روح فرسا خیال، اماں ابا کے

Scanned with CamScanner

بڑھاپے کے ساتھ بیماریوں کی الفت۔ کچھ ہی دن بعد اس کی صحت، حسن، خوشیاں اور قناعت چھین گئی۔ اس کے بدلے فکروں کا بھاری بوجھ اس پر لاد دیا گیا۔ اس پر کسی کو بھی رحم نہ آتا۔ غریب گھرانے کا گریجویٹ۔ کوئی کیوں سمجھے کہ اسٹیشن پر منڈلاتے ہوئے قلیوں اور بار لادنے والے خچروں سے کچھ زیادہ ہی بوجھ اُٹھاتا ہے۔ پھر اگر لوگ اسی پر رحم کھانے لگیں۔ تو آخر پیٹ کہاں سے بھریں؟ کوئی اللہ میاں تو بلندی سے پستی کی طرف آ کر غریبوں کا پیٹ بھرنے سے رہے۔ یا بیچاری حکومت تو انکے پیٹ کے پیچھے ماری ماری پھرنے سے رہی۔ اگر وہ ایسا کرے بھی تو بھلا اسے حکومت کون کہے گا؟ اور اگر اللہ میاں پستی کی طرف آنے لگیں تو انہیں کون اللہ میاں مانے گا؟ شاید کوئی نہیں۔ ہاں تو اس نے بھی چپکے سے سارا بوجھ اُٹھا لیا۔ اپنی ضروریات کا گلا گھونٹ گھونٹ کر وہ گھر والوں کا پورا کرتا۔ اس کے باوجود چین کہاں ـــ بہنیں اپنی شادی کے لئے جہیز جمع نہ ہوتے دیکھ کر کڑھتیں۔ منہ سے تو کچھ نہ کہتیں مگر اپنی ہر حرکت سے بھائی کے سامنے حد سے گذری ہوئی مجرد زندگی سے اُکتاہٹ اور نفرت کا مظاہرہ کرتیں۔ بھائی الگ کِل کِل کرتے۔ ہمارا مستقبل خراب ہو رہا ہے۔ ہمیں پڑھواؤ۔ ہمیں فلاں کام سکھواؤ۔ اس پر غضب یہ کہ آج اماں کو دمے کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ کل ابا کو بخار نے دبوچ لیا، دوا لاؤ۔ مارے خوف کے وہ گھر آتے کانپتا لیکن کب تک ـــ آخر رات کو تو گھر آنا ہی پڑتا۔ ہر ایک اپنی اپنی تکلیفیں رونے بیٹھ جاتا۔ اور وہ ایک لفظ کہے بغیر بے بس سا بیٹھا سنا کرتا۔ حالانکہ گھر میں سبھی تو اچھی طرح جانتے تھے کہ اس سے کچھ کہنا سننا بیکار ہے وہ کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ مجبور ہے بالکل مجبور مگر وہ سب بھی مجبور تھے۔ آخر

وہ کس سے کہتے۔ ہمیں بچالو۔ ہم تباہ ہوئے جا رہے ہیں۔ ہم سے اب مصیبتیں نہیں جھیلی جاتیں۔ بے چارے غریب۔ وہ سب کہنے پر مجبور تھے اور وہ سننے پر۔ خیر، یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ لیکن ماں نے خان بہادر کی لڑکی سے اس کی شادی طے کر کے اسے سب سے زیادہ تکلیف دی۔ ہر وقت کی ہائے ویلا اور شکایتوں سے بھی زیادہ تکلیف۔ مارے کرب کے وہ چیخ پڑا۔ مجھ سے آنکھوں دیکھے مکھی نہ نگلی جائے گی۔ چاہے وہ خالص گھی میں ترکیوں نہ ہو۔ مجھے قے ہو جائیگی۔ مجھے مجبور نہ کیا جائے۔ مگر ماں نے اسے چپ کرانے کو اپنے کپکپاتے ہاتھ اور آنسو سے کام لیا۔ بھائیوں نے مستقبل تباہ ہونے کی دھمکی دی۔ بہنوں نے ملتجی نظروں سے سمجھایا کہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ اور اسے بے بسی سے چپ ہو جانا پڑا۔ خان بہادر کی لڑکی کے خیال سے متلی محسوس کرتا پر منہ سے اف نہ کرتا صاف نہ کہتا کہ کچھ ہو ہم نہیں کر سکتے یہ شادی۔

جانے خان بہادر کو کیا سوجھی تھی۔ کہ اپنی ایسی بدصورت اور کند ذہن لڑکی کو پہلے نوسات پردوں میں گھونٹا پھر چند دن تعلیم کی قید جھلوا کر اسے آزاد کر دیا۔ تاکہ خان بہادری کی اکڑ ہر جگہ نظر آتی رہے۔ ادھر بدصورت قیدی جس نے ایک عرصے تک قید میں پھڑپھڑا کر دن گزارے تھے۔ آزاد ہوتے ہی بدنظمی پھیلانا شروع کر دی ادھر چہلیں۔ ادھر چہلیں۔ جانے کس تر سے بھنکے نے مکھی سمجھتے ہوئے بھی اسے نگل لیا۔ خان بہادر نے سوچا کہ لاؤ ایسا ہے تو ہضم کرا دی جائے۔ آخر تو انہیں ایک اچھے بر کی ضرورت تھی جو کسی طرح نہ جڑ رہا تھا۔ مگر توبہ۔۔۔ شریر قے کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ اتنی دور کہ خان بہادر ٹپٹا کر رہ گئے۔ اس کے بعد ہی انہوں

Scanned with CamScanner

نے اپنی غریب بہن اور بھانجے، جن کے نام سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے۔ سرپرستی کا بیڑا اٹھالیا۔ آخر تو بہن اور بھانجے کی کچھ محبت ہوتی ہی ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی دور کے رشتے کے کیوں نہ ہوں۔

بھائی بہن ملے۔ دل کھول کر —— بہن روئی، اپنی مصیبتوں کی داستان سنا کر بھائی نے مصیبتیں ختم کرنے کا وعدہ کیا۔ بھانجے کو داماد بنانے کے لئے۔ اور دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگے تو شادی کا معاملہ طے تھا۔ ماں نے کچھ بھی تو نہ سوچا کہ وہ کیا کر رہی ہے؟ اس نے یہ بھی تو نہ دیکھا کہ لڑکی کیسی سرعت سے نیچے ہی نیچے پھیلتی جا رہی ہے۔ یہ آخر کس لئے؟ اسے تو بس دولت چاہئے تھی۔ دولت۔ اپنا۔ اپنے بوڑھے جیون ساتھی کا اور اپنے دوسرے بچوں کا سکھ دیکھنے کے لئے۔ پھر اس کے آگے وہ کیا دیکھتی؟ کیا سوچتی؟ کھٹ سے شاندار طریقے پر رسم منگنی ادا کر دی گئی۔ خان بہادر بھی خوش تھے کہ چلو اور کچھ نہیں تو فخر کرنے کے لئے گریجویٹ داماد تو ملا۔ اور بدنامی سے بھی بال بال بچ گئے۔

منگنی کے بعد اس نے محسوس کیا کہ گھی چپڑی مکھی اس کے منہ میں قید بھنبھنا رہی ہے اور جب وہ نگلے گا تو اس کی آنت آنت اُلٹ جائے گی۔ اف۔ کتنا مجبور تھا وہ مکھی نگلنے پر۔ وہ جانتا تھا کہ گھی مہنگا ہے۔ بہت مہنگا۔ اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ اپنے گھر والوں کو سوکھے کے عارضے سے بچا لے۔ آہ ——

بیچارہ وہ ——

وہ چپ پڑا تھا۔ منہ اوندھائے۔ تلے اوپر پاؤں رکھے زور زور سے ہلا رہا

تھا۔ جیسے اس کی مجبوری۔ بے بسی۔ اضطراب سنگر بیروں میں اتر آئی ہو۔ کل اس کی شادی تھی اور اسے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کل اس کی زندگی چھینی جانے والی ہے۔ اسے قبر کی خوفناک تاریکی میں چھپایا جانے والا ہے۔ اس نے کروٹ لی اور اسی طرح بے سدھ چت پڑ کر چھت سے آنکھیں لگا دیں۔ جیسے کسی سرمایہ دار کی کار کے نیچے دبنے کے بعد کوئی غریب آسمان سے آنکھیں لگا دے۔ چند لمحے کے لئے۔ اور پھر اپنے اللہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں مدد کے لئے پکارتا ختم ہو جائے۔ تو شاید وہ بھی چھت سے نظریں لگائے اپنے اللہ کو یاد کر رہا تھا مگر اس کی بہنوں کے زور سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں اور اس کی چھت سے لگی ہوئی آنکھیں کمرے کی سرمئی تاریکی میں بے بسی سے ناچنے لگیں۔ بالکل اس طوائف کی طرح جسے ناچنے سے نفرت تو ہو مگر چند سکوں کے لئے اسے ناچنا پڑے۔ ایک تھکا ہوا اداس ناچ۔ اس کی بہن کا ایک زوردار قہقہہ کمرے کے بند دروازوں سے ٹکرایا تو وہ کراہ اٹھا۔ ہائے ___ اف ___ فوہ۔ اور پھر وہ سوچنے لگا ___ بہنیں بڑے آدمیوں سے شادی کرنے کے تصور سے کھلی جا رہی ہیں۔ بھائی اپنی آئندہ زندگی کا پروگرام مرتب کر رہے ہوں گے۔ باپ خود کو خان بہادر تصور کر رہا ہوگا۔ حکومت سے خطاب حاصل کئے بغیر۔ اور اماں ___ وہ کتنی خوش ہے آج۔ اسے کھانسی کا دورہ بھی نہیں پڑا۔ سب کل کے تصور میں گم ہیں۔ کل انہیں کوٹھی ملے گی رہنے کو۔ ملازم ملیں گے خدمت کو۔ موٹر ملے گی سیر کو۔ دولت ملے گی عیش کو اور مجھے مکھی ملے گی نگلنے کو ___ میرے معبود! یہ سب کیا جانیں۔ کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ بے ہنگم۔ بدصورت جانور میری زندگی کا

ساتھی بنایا جائے گا۔ ایک دبلے پتلے کمزور انسان کے پہلو میں پہاڑ دھکیلا جائے گا۔ وہ چھا جائے گی مجھ پر۔ میں اس کے سامنے ایک کمزور کھٹملا معلوم ہوں گا۔ انگلیوں سے مسل کر پھینک دینے والا کھٹملا۔ اور ـــ سوچتے سوچتے وہ تڑپ کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے تک بیٹھا رہا اور پھر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرلیں اور تصور رہی تصور میں خان بہادر کی لڑکی اپنے قریب کر کے دیکھنے لگا۔ وہ اسکے قریب ہے۔ بالکل قریب۔ پہلو سے پہلو ملائے۔ وہ اپنی جگہ پر سمٹا ہوا پڑا ہے وہ اپنی اشارۂ مخصوص والی آنکھ سے اسے دیکھ رہی ہے۔ بڑے انداز سے۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ہنہ! سمٹے ہوئے کیوں ہو۔ میں تو تمہاری ہوں۔ وہ اپنے دل پر قابو کر کے اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ پھولا ہوا سیاہ ہاتھ۔ وہ بے تحاشہ ہنستی ہے اور اس کا پھولا ہوا تو ند کلبلا اُٹھتا ہے۔ اسی طرح جیسے اس میں بہت سے چوہے بند ہوں۔ وہ گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اسے اپنی بد نصیبی پر رونا آنے لگتا ہے اور ـــ تصوّر کی لڑی ٹوٹ کر بکھر گئی۔ اسے واقعی رونا آگیا۔ اس نے اپنا منہ تکئے میں چھپالیا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ بڑی دیر تک۔ اور جب روتے روتے تھک گیا۔ سر بھاری ہونے لگا تو آنسو پونچھ کر کمرے کے ہلکے سے اندھیرے میں گھورنے لگا۔ اور گھورتے گھورتے اسے طاہرہ کا خوبصورت بھولا بھالا چہرہ تاریکی میں ابھرتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ اس کے جسم کا رواں رواں کپکپا اٹھا۔ اس کا دل چاہنے لگا کہ کاش یہ نظروں کو دھوکا دینے والا چہرہ سچ مچ اس کے قریب آجائے۔ اس قدر قریب کہ وہ اسے اپنے سینے سے لگالے۔ وہ اس میں سما جائے۔ اسے ہمیشہ کے لئے اپنے میں چھپالے۔ پھر اس سے

التجا کرے۔ طاہرہ! میری جان! مجھے بچالو۔ مجھے آنکھوں دیکھے مکھی نگلائی جارہی ہے۔ مجھے ہیضہ ہوجائے گا۔ میں مرجاؤں گا۔ تم میرا ساتھ دے کر مجھے بچالو۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ اتنی کہ تم سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ تمہارے کارن میں نے فاطمہ کو ٹھکرادیا۔ اس کی دولت پر لات ماردی۔ میری جان۔ میری بن جاؤ۔ پھر میرے ساتھ آندھی بن کر اُٹھو۔ خان بہادر کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے اندھا کردو۔ اس کی دولت کو غبار کی تہوں میں دفن کردو۔ تاکہ وہ پھر نہ کہہ سکے تمہیں مکھی نگلنا ہوگی —— مگر وہ کس سے التجا کرتا ؟ اندھیرے میں ابھرا ہوا چہرہ اس کے قریب نہ آیا جو وہ یہ سب کچھ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیتا۔ اس نے اپنا منہ بازوؤں میں چھپالیا۔ اور سوچنے لگا۔ اس دن طاہرہ راستے میں ملی تھی۔ تو کتنی کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا چہرہ کیسا زرد ہورہا تھا۔ بیوہ ماں اور دس چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کا بوجھ اُٹھانے والی اکیلی لڑکی۔ غریب پسی جارہی ہے۔ اس پر ستم کی ناکامیاں۔ اس دن اس نے کیسا خوش ہوکے کہا تھا۔ "کہد یا عارف' شادی کریں گے تو تمہارے ساتھ ورنہ نہیں۔ بس اماں سے کہنے کی دیر ہے۔ فوراً راضی ہوں گی۔ ہم دونوں ملکر بہت پیدا کریں گے۔ دونوں گھروں کا پورا کریں گے۔ ساری مصیبتیں دور ہوجائیں گی۔ این نا ؟" اف معصوم۔ اس نے جب اپنی ماں سے کہا تو وہ کیسا سر پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ "میری بچی ہم سب تباہ ہوجائیں گے تو غریب سے شادی کرکے ہمیں ایک پیسہ نہ دے سکے گی۔ وہ کنگال بھلا کب چاہے گا کہ تیرا ایک پیسہ ہم پر خرچ ہوجائے۔ کسی امیر سے شادی کرتا کہ ہم سب چھپے چوری کے پیسے سے ہی پلتے

رہیں۔ اور اگر تو اتنے دن شادی ہی نہ کر کہ سب بھائی بہن ہاتھ منہ کے ہو جائیں تو کیا بُرا ہے؟" دوسرے دن طاہرہ نے کیا صفائی سے مجھ سے ایک ایک بات کہدی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کے اور پھر منہ پھیر کر کہد یا کہ "اب کسی سے بھی شادی نہ کروں گی۔ میری ماں نے مجھے پڑھایا۔ آخر کس دن کے لئے۔ مجھے ان کی خدمت کرنا ہے" کمبخت ظالم ماں۔ اپنی لڑکی کی زندگی برباد کر رہی ہے۔ میں نے اسے کیسا کیسا سمجھایا۔ تمہارے گھر والوں کو اپنے خون سے پالوں گا۔ تم یقین کر لو۔ لیکن اس نے مجھ پر بھروسہ نہ کیا۔ شاید اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہو گی کہ کمائی کرنے والی بہو اگر اپنے گھر والوں کو بھی کچھ دینا چاہے تو روز روز خانہ جنگی سے سامنا رہتا ہے اگر تم کو اپنی ماں بہنوں کا ایسا ہی خیال تھا تو شادی ہی کیوں کی لیکن میں کبھی ایسی باتیں نہ ہونے دیتا۔ خیر اچھا ہی ہوا جو وہ راضی نہ ہوئی ورنہ اماں! وہ تو کسی طرح اسے چین نہ لینے دیتیں۔ میری بھولی بھالی طاہرہ! مر جاتی کوفت کھا کھا کے۔ میرا بس چلے تو اسے بھگا لے جاؤں دُور ـــــ بہت دور تاکہ اس کے اور میرے گھر والے پیچھا نہ کر سکیں۔ وہ یہیں بھوک سے بلبلا بلبلا کر مر جائیں۔ میں ان کی آہیں نہ سن سکوں۔ ان کے آنسو نہ دیکھ سکوں۔ انہیں اچھی طرح سزا ملے۔ اپنی اولادوں کو پڑھا لکھا کے اپنی جائداد سمجھ کر ناجائز فائدہ اٹھانے کی سزا۔ غلام ملک میں زیادہ سے زیادہ بھیک مانگنے کے لئے بچے پیدا کرنے کی سزا اور ـــــ کھوں۔ کھر۔ کھر کھس۔ کھس۔ ماں کے اچانک زور زور سے کھانسنے کی آواز نے اسے سوچنے سے چونکا دیا۔

"کیوں کھانس رہی ہو۔ خان بہادر کی سگی بہن۔ جلدی سے شہر کے کسی

مشہور ڈاکٹر کو بلا کر کھانسی کا علاج کیوں نہیں کرتیں ؟" اس نے زہر میں بجھی ہوئی آواز سے کہا۔ اور ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ ماں سینے سے اٹھتی ہوئی کھانسی حلق میں قید کرنے کی کوشش کرنے لگی اور اس کوشش میں اس کے حلق سے بڑی عجیب عجیب آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ کچھ ایسی جیسے ذبح ہوتے ہوئے بکرے کے حلق سے آوازیں آتی ہیں۔ بیچاری ماں ـــــ جیسے وہ سب کچھ اپنے عیش ہی کے لئے تو کر رہی تھی جو وہ مارے طعنوں کے اس کا کلیجہ چھلنی کئے دے رہا تھا۔ وہ پھر پاؤں ہلا ہلا کر سوچنے لگا۔

یہ آخر مر کیوں نہ گئیں، جو آج اپنا، اپنے بڈھے ساتھی کا سکھ تلاش کر رہی ہیں۔ اپنے دوسرے بچوں کا مستقبل بنانے کے لئے مجھے برباد کر رہی ہیں۔ گھر میں بند رہنے والی بے بس لڑکیوں کی طرح۔ لیکن میں ایسا نہ ہونے دوں گا۔ چاہے ماں دمے کے ساتھ دم توڑ دے۔ باپ دولتمند بننے کی تمنا لئے دائمی نیند سو جائے بھائیوں کا مستقبل خراب ہو جائے۔ وہ بڑھ کر مزدوری کریں چلچلاتی گرمی کی دوپہر یا میں۔ بھر دل جوان بہنیں اپنی شادیوں سے قطعی مایوس ہو کر گھر آنے والے بہشتی بھنگی کے ساتھ بھاگ جائیں۔ میں پچاس روپوں کی خاطر میز پر جھکے جھکے اپنی ریڑھ کی ہڈی توڑ ڈالوں مجھے یہ سب منظور۔ مگر ـــــ

"آہ ـــــ ہائے۔ اللہ اٹھا لے مجھے۔ اب نہیں سہا جاتا۔" وہ سوچتے سوچتے پھر چونک پڑا اس کی ماں کراہ کراہ کے اپنی موت کی دعا مانگ رہی تھی۔ وہ ایک دم بلبلا اٹھا۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ بس اس سے یہی تو نہ برداشت ہوتا۔ ماں کی کراہ اور موت کی دعا۔

میری اماں — وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ مت کراہ۔ خدا کے لئے خدا کے لئے۔" اور اس کا سر بھاری ہونے لگا۔ دم بدم۔ آنکھوں کے سامنے سرخ وزرد۔ دھبے ناچنے لگے۔ مانجھے اور نکاح کے جوڑوں کی طرح سُرخ وزرد دھبے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ تھکے ہوئے دماغ پر آہستہ آہستہ نیند چھارہی تھی۔

اس کی شادی ہوگئی۔ کوٹھی۔ کار۔ دولت اور نہ جانے اسے کیا کیا دیا گیا — لوگوں نے دیکھا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمر توڑ سزا بھگتنے والا کلرک اور بد قسمت — آخر تو غریب انسان تھے۔ چیخ پڑے۔" ایک دن گھورنے کے بھی پلٹتے ہیں۔" جیسے غریب گھورا ہی تو ہوتا ہے۔ ادھر ادھر کی غلاظت لادنے والا گھورا۔ بے وقوف انسان۔ انہوں نے کیوں نہ اپنے افلاس کے گھورے پر شاندار بلڈنگ تعمیر کرلی؟

ہنہ! بھلا وہ یہ کیا جانیں کہ وہ بہت کچھ پانے کے بعد بھی کتنے عرصے تک رویا۔ بلبلایا۔ وحشت سے بھاگ کر کوٹھی اور ویرانہ ایک کردیا۔ جیسے اس پر دیوانگی سی طاری رہتی۔ وہ اپنی ماں کو دیکھتا تو اس کا گلا گھونٹنے کی تمنا میں اس کے ہاتھوں کی نسیں پھولنے لگتیں۔ وہ بھائیوں کو ٹھاٹ کئے اکڑتا دیکھتا تو اسکا دل چاہتا کہ ان کے سروں پر ڈلیاں رکھ کر کسی بنتی ہوئی بلڈنگ کی طرف جانوروں کی طرح ہانک دے۔ بہنوں کو کوٹھی کے ملازموں کے ساتھ راتوں رات بھگا دے تاکہ ان کی شادیاں بڑے بڑے آدمیوں سے نہ ہوسکیں۔ وہ سینکڑوں کا جہیز نہ لے جاسکیں۔ باپ کو بھیک مانگنے کے لئے سڑک کے کنارے بٹھادے۔

اور پھر خود بھی بھاگ جائے ۔ دور ــــ کہیں بہت دور۔ کوٹھی میں آگ لگا کے تاکہ خان بہادر اور اس کی مکھی آگ میں چرمرا کر رہ جائیں ۔ وہ مار ڈالے تباہ کر دے۔ آخر تو اسے بھی تباہ کیا گیا تھا۔ پھر آخر سب کیوں عیش کرتے۔ آخر کیوں؟ کیوں ــــ؟ مگر وہ ایسا نہ کر پاتا۔ جب بھی اس کا غم و غصہ کم ہوتا۔ اور وہ ٹھنڈے دل سے غور کرتا تو اپنے میں اتنی طاقت بھی نہ پاتا کہ ایک بھنگے کو تباہ کر دے ۔ مار ڈالے۔ کجا ماں باپ ۔بہن بھائی اور پھر خان بہادر کے کڑے تیور۔ جو اس نے اپنی دیوانگی کے پیچھے کتنی ہی بار دیکھے تھے۔ کیا وہ ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتا تھا ــــ؟ نہیں ۔ کبھی نہیں۔ ماں بہن رکھنے والا بھلا دنیا میں کس کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ کسی کا بھی نہیں ــــ!

شادی کے چار ماہ بعد اچانک خان بہادر نے داماد ۔بیٹی اور بہن کو کشمیر کی سیر کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ وہ تو نہ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا زور ہی کیا چلتا ۔ ان دنوں اس کی بیوی بہت مضمحل رہنے لگی تھی ۔ اس لئے دل بہلانے کہیں نہ کہیں جانا ضروری تھا ۔بہت ضروری ــ مگر کشمیر جانے کے بعد اس کا اضمحلال کم نہ ہوا ۔ بڑھتا ہی گیا ۔ ہاں اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ اب اس کا رنج و غم کشمیر کی ہواؤں میں اچانک اڑ گیا ۔ اس نے اپنے گزشتہ سوگ پر بے شمار قہقہے لگائے دیوانوں کی طرح نہیں ۔ ایک ہوشمند انسان کی طرح ۔ اس نے کتنی ہی بار سوچا ۔بھلا میں رونا کیوں تھا؟ کیوں آہیں بھرتا تھا؟ آخر کس لئے میں اس دولت سے انکار کرتا تھا جو خان بہادر اپنی لڑکی کے ساتھ عنایت کر رہے تھے؟ بھلا کیوں میں طاہرہ جیسی بھکارن کو خان بہادر کی لڑکی پر ترجیح دے رہا تھا؟ کیا صرف اس

Scanned with CamScanner

لئے کہ وہ خوبصورت اور معصوم تھی؟ لاحول۔

میں کتنا نادان تھا اس وقت۔ مجھ سے آنکھوں دیکھے مکھی نہ نگلی جائے گی مجھے ہیضہ ہو جائے گا۔ میں مر جاؤں گا۔ ہا ہا۔ اس نے سوچ سوچ کر کتنی ہی بار خود کو منہ چڑایا قہقہے لگائے۔ اور آخر ایک دن ——

ایک نیک دن دیکھ کر اس نے خان بہادر کی دولت کا صحیح مصرف شروع کر دیا۔ حسین حسین ننگی بھوکی لڑکیاں اور وہ —— انتہائی رازداری اور خاموشی سے وہ مہکتے ہوئے پھول مسل مسل کر پھینک دیتا۔ بڑی بے دردی سے —— کتنا خوش تھا وہ اس طرح؟ ہاں کبھی کبھی اس کا ضمیر چیخ پڑتا۔ اسے سمجھانا چاہتا۔ تو وہ تھوڑی دیر کے لئے مضمحل ہو جاتا۔ بس یوں ہی سا۔ وہ چند منٹ سوچتا میں یہ کیا کر رہا ہوں میری گزشتہ زندگی کیسی پاک صاف تھی۔ خیر جی ہو گا۔ جیسا زمانہ ویسی باتیں۔ بس پھر ہنس پڑتا زور سے۔ یہ سوچ کر کہ میرے غریب ضمیر پر ابھی دولت کا ہتھوڑا نہیں پڑا جو چیخ پڑتا ہے۔ اور جب پڑ جائے گا تو قبرستان کی سی خاموشی اختیار کر لے گا۔ اور پھر —— وہی ہر روز ایک تازہ مہکتا ہوا پھول —— یوں ہی بہت سے دن گزر گئے۔ اور ایک دن ——

سورج نے اپنی روشنی مغرب میں چھپا کر اندھیرا اگل دیا۔ تو وہ کچھ لڑکھڑاتا جھومتا ٹیکسی سے اترا اور باغ طے کرتا ہوا کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ روشنی کی۔ کپڑے تبدیل کئے۔ اور صوفے پر گر کر ہولے ہولے گانے لگا۔

"اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے"

تھام لے
اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
لے ۔ لے

اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خمار تھا اور جسم تھکن سے چور۔ ابھی ذرا دیر پہلے وہ ایک بہت ہی خوب چمکتی، لچکتی حسینہ کے ساتھ مسلسل ڈیڑھ گھنٹے تک کلب گھر میں ناچ کر آیا تھا۔ اور اسے اس وقت اپنا ناچتے ناچتے لڑکھڑانا اور ہم رقص کا اسے تھامنا یاد آرہا تھا۔ وہ اس کی یاد میں اور بھی زور سے گانے لگا۔

اے مری ہم رقص ـــــ اے ۔ اے ۔ تھام لے ۔

ابھی وہ اس کی یاد میں جھوم جھوم کر گنگنا ہی رہا تھا کہ اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی سخت گھبرائی ہوئی ۔ چہرہ ایک دم سفید ۔ ٹانگوں میں ہلکی سی لرزش آنکھوں میں خوف ۔ وہ اس کے سامنے مبہوت سی کھڑی ہو گئی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی بری خبر سنانا چاہتی ہو۔ اس سے بھی زیادہ بری خبر کہ کسی مائی کا اکلوتا لال چند سکوں کی خاطر میدان جنگ میں توپ کے گولوں کی نذر ہو گیا ہو۔ یا کسی بنگالی دوشیزہ نے بھوک سے بے چین ہو کر اپنی دوشیزگی فروخت کر دی ہو۔

" اوہ ـــ اماں ! تمہاری صورت بڑی عجیب سی ہو رہی ہے۔ شاید بھوک کے سر میں درد ہو گا ۔ وہ مضمحل ہو گی تبھی نا ؟" وہ طنز سے مسکرایا ۔ ماں بھوک کے اضمحلال سے خود بھی تو مضمحل رہتی تھی ۔

" نہیں بیٹیا ! وہ بات یہ ہے کہ ـــــ" وہ بات پوری نہ کر سکی ۔ اور

گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"بتا بھی ڈالو کیا بات ہے۔ کیا تمہاری بہو نے میرے زیادہ گھومنے پھرنے پر اعتراض کیا ہے"؟

"نہیں میرے لال" وہ دیوار سے ٹک گئی۔

"یہ بات نہیں، وہ بات نہیں، پھر آخر ہے کیا؟" اس نے کچھ چڑ کر سوال کیا۔

"تیرے ہاں ——" وہ گھگھیا گئی۔

"ہاں! کیا میرے ہاں؟" وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"خوشی ہوئی ہے" ماں نے دو تین لمبی لمبی سانسیں لیں۔ جیسے بڑی بات کہہ ڈالی ہو۔

"اوہ —— خوشی۔ وہ تو میرے ہاں روز ہوا کرتی ہے۔ اب تم بتا ڈالو۔ کہ اور کون سی نئی خوشی ہوئی ہے" وہ ہنس پڑا۔

"تیرا بچہ ——" ماں نے خوف سے اسے دیکھا اور وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا اسے فوراً ہی خیال آیا۔ وہ نجمہ، فقیرنی کی بچی نے شاید ماں سے آکر کہہ دیا کہ وہ میرے لطف وانبساط کا بوجھ لادے پھر رہی ہے اور چند ماہ بعد کسی فقیر یا فقیرنی کو جنم دینے والی ہے۔ بدمعاش۔ بے شرم۔ اسے کتنے روپے دیئے تھے کہ دیکھ تجھے میرا گھر معلوم ہو گیا ہے۔ تو وہاں جا کر کچھ نہ کہیو۔ اب کیا ہوگا اگر خان بہادر کو خبر ہو گئی تو —— تو ان کے غصے کا بھونچال پل بھر میں سب کو تباہ کر دے گا ——

بدمعاش۔ حرام زادی۔ کمینی۔

"اماں، تم سے کس نے کہا کہ میرا بچہ ـــ" اس نے خوف سے ماں کو دیکھا اور پھر خوف چھپانے کے لئے مسکرا دیا۔

"کہا کس نے، چار بجے سے بہو کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ اور اب اللہ نے رحم کیا، خدا تجھے مبارک کرے۔" اسے مسکراتے دیکھ کر ماں نے جلدی جلدی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہدیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اسے بلندی سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا ہو۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ پڑے۔ بڑھیا کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جو شادی کے پانچویں مہینے مجھے باپ بنا رہی ہے۔ وہ چند لمحے ماں کا منہ تکتا رہا اور پھر چیخ پڑا۔

"کیسا میرا بچہ ـــ میں مار ڈالوں گا اسے۔" وہ مارے غصے کے ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس کا سینہ پھول رہا تھا اور بازو تنے جا رہے تھے۔ اس طرح جیسے ان کے بازوؤں میں ساری دنیا کو لپیٹ کر مار ڈالنے کی طاقت آ گئی ہو۔ ماں اسے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"سمجھیں تم ـــ میں اسے مار ڈالوں گا۔" وہ ماں کی طرف بڑھ کر زور سے چیخا اور ماں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہم سب تباہ ہو جائیں گے، مت چیخ میرے لال! میں نے تجھے نو مہینے پیٹ میں رکھا تو کیا اس کا بدلہ ہمیں تباہ کر کے دے گا۔ اگر ایسا ہے۔ تو تو مجھے مار ڈال ابھی ابھی۔ مگر اپنے بھائی بہنوں اور بوڑھے باپ پر رحم کر۔ نہیں تو ان کے ہاتھوں میں بھیک کا پیالہ ہو گا۔ اور سڑک کا کنارہ۔" وہ رو رو کر اسے سمجھانے لگی۔ اور اس کا غصہ بے چارگی میں تبدیل ہو گیا۔ ماں نے اپنا ہاتھ

Scanned with CamScanner

اس کے سر پر رکھ دیا اور زور سے کپکپانے لگی۔

"اماں —" اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ آنکھوں کے گوشوں میں چھپے ہوئے آنسو بہ جانے کو مچلے مگر وہ ضبط کر گیا۔

"ہاں۔ میرے بیٹے! بس اب رنج نہ کر، لے خوش ہو جا۔"

"خوش —؟" اس کا دل چاہا کہ ڈھاریں مار مار کر روئے۔ ہائے — ہندوستانی غریب گھرانوں کا کماؤ پوت۔ کوئی تو دیکھے ان کی بےلسبی۔

"آہ — ہائے — ہونھ — ہونھ!" بہو کے زور سے کراہنے کی آواز آئی اور ماں بےتابی سے دروازے کی طرف مڑی۔

"ہاں — آن — میرے لال اب چپکا رہیو۔ میں جا رہی ہوں۔" اس نے جاتے جاتے مڑ کر کہا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ دولت مند بہو کے ٹکڑوں پر پلنے والی ساس — جیسے بلی کے پنجوں میں دبا ہوا چوہا۔

ماں کے جانے کے بعد وہ بےسدھ سا صوفے میں دھنس گیا۔ پھر اٹھ کر بےتابی سے باغ کی طرف کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اور دل پر اداس ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ چھٹکی ہوئی چاندنی میں وہ دیر تک ایک ایک پودے کو گھورتا رہا۔ گھی چپڑی مکھی ہضم کی — وہ سوچنے لگا۔ — صرف اس لئے کہ وہ گھی ساتھ لائی تھی۔ مگر اب کہا جا رہا ہے کہ غلاظت پر بیٹھی ہوئی مکھی بھی نگل لو۔ صرف اس لئے کہ وہ گھی چپڑی مکھی کا فیض ہے۔ منہ سے اف نہ کرو۔ بالکل چپ رہو۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور — وہ سوچتے سوچتے رو پڑا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ لیڈی ڈاکٹر اٹیچی کیس

تھا نے۔ اونچی ایڑیوں پر جھکولے کھاتی کوٹھی سے نکلی تو آنسو رُک گئے۔ اس کا دماغ پھر غصے سے بھنّا اُٹھا۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔

"میں مار ڈالوں گا دونوں کو۔ ضرور۔ ضرور۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ اچھا ہے سب تباہ ہوجائیں، مرجائیں" وہ بڑبڑاتا ہوا صوفے میں دھنس گیا۔

"کوئی بگڑے، کوئی بنے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ سب کو تباہ ہونا چاہئے۔ ابھی ۔۔ اسی وقت" اس نے جوش سے مٹھیاں بھینچ لیں اور اُٹھنا چاہتا تھا کہ تیز چکر نے اسے بے سدھ کر دیا۔ اس کا سر ایک طرف ٹک گیا۔ اور پھٹی پھٹی سرخ آنکھیں پٹ سے بند ہوگئیں اور۔۔۔

خون میں لت پت اس کی بیوی اور بچے کی لاشیں زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے چھری پھینک دی اور دونوں کو گھورنے لگا۔ اس کا جوش اور غصہ خون بہا دینے کے بعد بھی کم نہ ہو رہا تھا۔ وہ لاشوں کو اپنے پیروں سے روندنے کے لئے بڑھا، کہ ایک دم پولیس آگئی۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی گئی۔ اور سپاہی اسے کھینچ کر لے جانا چاہتے تھے کہ معاً اسکے ماں باپ، بھائی سب آگئے وہ بلک بلک کر رو رہے تھے۔ اس نے منہ پھیر لیا ان سب کے رونے سے اس کے دل میں درد ہونے لگا۔

"بھیا۔۔۔" اس کی سب سے بڑی بہن چیخی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی روتی ہوئی آنکھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ یہ کیا کیا۔ اپنے ساتھ میری تمناؤں کو بھی پروان چڑھنے سے پہلے سولی پر چڑھنے کا سامان کر دیا۔ ظالم۔ پھر اس کی نظر بھائیوں پر پڑی وہ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اپنے دامنوں میں جذب

Scanned with CamScanner

کر رہے تھے۔

اسے ایسا محسوس ہوا کہ ان کی آنکھوں سے گرتا ہوا ہر ہر آنسو گرمی کی چلچلاتی دوپہر یا میں کام کرنے والے مزدور کے پسینے کا قطرہ ہے۔

"ہائے میں نے یہ کیا کیا — سب کو اپنے ہاتھوں تباہ کر دیا" وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ اور پھر پوری طاقت سے خود کو سپاہیوں کی گرفت سے چھڑانا چاہا۔ مگر ان کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

"مجھے چھوڑ دو" اس نے زور سے چیخنا چاہا۔ مگر آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔

چھوڑ دو — چھوڑ دو" اس نے پوری طاقت سے چیخنا چاہا اور ——— اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ساری جان سے پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کمرے میں ہر طرف دیکھا۔ وہاں نہ تو روتے ہوئے بھائی بہن تھے اور نہ سپاہی۔ اس نے اپنا دکھتا ہوا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"میں اندر آسکتی ہوں؟" ایک ان سنی باریک آواز نے انگریزی میں اندر آنے کی اجازت مانگی۔

"آجاؤ" اس نے جلدی سے اپنے بکھرے ہوئے بال درست کئے۔ اور رومال سے چہرے کا پسینہ خشک کر لیا۔ پردہ ایک جھٹکے سے ہٹا۔ اور نرس اندر داخل ہوئی۔ سر سے پاؤں تک چمکتی ہوئی بجلی۔ لبوں پر میٹھی سی مسکراہٹ۔ نہ جانے کیا سفید کپڑے میں لپیٹے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ وہ چند منٹ تک اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اور پھر کھڑا ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

"تم اپنا بچہ دیکھو گے؟" نرس نے انگریزی میں سوال کیا۔

"اوہ ——" وہ ہنس پڑا۔ جیسے کسی نے مار کر ہنسایا ہو۔

"دیکھو ——" وہ آگے بڑھی —— یہ دیکھو۔ اس نے بچے کے منہ پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ لال لال گوشت کا لوتھڑا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹا۔ مارے رنج کے اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"بہت اچھا ہوگا بڑا ہو کے۔" اسے چپ دیکھ کر نرس نے خود ہی تعریف کر دی۔

"ہاں بہت اچھا۔" اس نے کہا اور شدتِ رنج سے اسے ابکائی آگئی۔

"تمہیں کیا ہو گیا؟"

"مکھی نگل گیا تھا۔" اس نے بچے کو دیکھ کر نرس کو دیکھا۔

"پھر تم کو قے کرنا چاہئے۔" نرس نے علاج بتا کے ایک لمبی سانس لی۔

"اوہ —— نہیں مجھے ہضم ہو جائے گی۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم کو ہضم ہو جائے گی؟" مارے حیرت کے نرس کا جسم پھڑک اٹھا۔ اور سرخ ہونٹ کھل گئے۔

"ہاں ہاں۔" وہ زور سے ہنس پڑا۔ نرس کا پھڑکتا ہوا جسم، کھلے کھلے ہونٹ۔ اسے اپنا رنج و غم کوسوں دور بھاگتا ہوا معلوم ہوا وہ دو قدم آگے بڑھا۔ اور اس کے نارنگی کی پھانکوں جیسے کھلے ہوئے لبوں کو اپنے ہونٹوں سے بند کر دیا۔ بچہ بیچ میں دبا اور ریں ریں سی کر کے رہ گیا۔

"لو ہضم ہو گئی مکھی۔" وہ الگ ہٹ کر بولا۔

"نون سنس" نرس نے ناک بھوں چڑھائی۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا۔
وہ تو نارنگی کی پھانکوں کا رس پی کر مدہوش ہو رہا تھا۔ بھلا چڑھی ہوئی ناک بھوں کا اثر کیا ہوتا خاک ___؟

"نون سنس"۔ اب اس نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔ اور وہ مدہوشی سے ہوش میں آیا۔

"تم کچھ چاہتی ہو۔ ضرور ___ اسے یہ لو" نوٹوں کی ایک گڈی جیب سے نکال کر اس نے نرس کے کھلے ہوئے گریبان میں ٹھونس دی۔

"نون سنس"۔ اس نے پھر نون سنس کہا۔ مگر اس بار اس کی ناک بھوں نہ چڑھی ہوئی تھی۔ غصے سے آنکھیں نہ نکلی ہوئی تھیں۔ بلکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی بجلی تڑپی ہوئی تھی، چہرے پر کچھ عجیب سی جھینپ تھی ___ بڑی عجیب سی جھینپ اور "نون سنس" میں چھپتا ہوا پیار۔

"اب جاؤ۔ رات بارہ بجے آنا۔ سمجھیں؟" اس نے اکڑ کر کہا۔ روپے جو پیشگی دے دیئے تھے اس لئے۔ اور پھر صوفے میں دھنس کر اچھلا۔ نرس بچے کو اٹھائے کمرے سے نکل گئی۔

"نون سنس کی بچی ___ وہ سوچنے لگا۔ روپے لینے کے بعد بھی نون سنس کہہ گئی۔ پیار ہی سے سہی۔ مگر ہمت تو تھی کہنے کی۔ ایک میں ہوں بزدل۔ کبھی نگل لوں ہضم کر لوں۔ لیکن منہ سے اف نہ کروں۔ پیار سے بھی نہیں۔ اوہ ___ خیر میرا اف نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو پھر شاید ___ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس نے کھسیائے ہوئے دل سے فیصلہ کیا۔ لیکن اس فیصلے سے

اس کا دل مطمئن نہ ہوا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ نرس کی جرأت نے اسے پھر سے مغموم کر دیا ہے۔ اسے اپنی زندگی کے گزرے ہوئے اندوہ ناک واقعات پھر نہایت شدت سے یاد آنے لگے۔ وہ خود تو نہ یاد کرنا چاہتا تھا لیکن پھر بھی ــــ وہ اپنا دھیان ہٹانے کے لئے حسین نرس کو بار بار اپنے سامنے لا کر اس کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ پر آج عورت کے حسن و جوانی کا نشہ۔ اس کی دلی کیفیات کی ترشی کے آگے ٹھہر ہی نہ رہا تھا ــــ اب اسے سخت گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ دل لمحہ بہ لمحہ کمزور ہو کر ڈوبنے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا اور وہ روشنی کی تلاش میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بجلی کے قمقمے کو دیکھنے لگا۔ جو اس کی آنکھوں کے سامنے مدھم ہوتے ہوتے جگنو بن کر غائب ہو گیا ــــ

کلاک نے بارہ بجائے ــ نرس سوئے ہوئے بچے اور زچہ کو چھوڑ کر دبے قدموں اس کے کمرے میں داخل ہوئی ــ وہ صوفے پر بالکل ساکت و صامت پڑا تھا ــ

"شریر لڑکے ــ" وہ بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"اٹھو! میں آگئی ۔" نرس اسے حسین طریقے پر جگانے کے لئے اسکے سینے سے لگ گئی اور پھر اچانک اس طرح الگ ہٹ گئی۔ جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو ــ اس کے شریر لڑکے کے گلے میں پڑی ہوئی سانسوں کی مالا موت جھپٹ چکی تھی۔

"اسے کیا ہو گیا ؟" وہ اس کی اچانک موت پر بارے حیرت کے چیختے چیختے رہ گئی۔ اور پھر اپنے وہاں موجود ہونے کا بھرم رکھنے کی خاطر لرزتی ہوئی

اس کمرے سے نکل گئی۔

"ہا۔ ہا۔ بیچارہ۔" نرس سوچتی ہوئی دبے قدموں زچہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی — نہ جانے کیا ہو گیا ایک دم۔ کیسا شریر اور پیارا لڑکا۔ شام کہہ رہا تھا کہ مکھی نگل گیا ہوں۔ اور اس وقت مر گیا۔ ہا۔ ہا —